ناران کی حسین وادیوں میں محبت کے حسین لمحوں کی داستان
فیصلہ
طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

یہ حقیقی زندگی سے تعلق رکھنے والی ایک حقیقی روئیداد ہے۔ اس روئیداد کے اکثر کرداروں سے میری ملاقات رہتی ہے۔ یہ کہانی آپ کو پاکستان کے شمال میں لے جائے گی۔ روئے زمین کے وہی حسین ترین مناظر جن کا چرچا پوری دنیا میں ہے۔ کاش ہم اس دولتِ خداداد کی قدر پہچانیں اور ان علاقہ جات کی سیاحت کو فروغ دے کر خاطر خواہ فوائد حاصل کر سکیں۔

وادیٔ کاغان اور ناران کے دل فریب نظاروں' بہتے چشموں سرسبز و شاداب مرغزاروں کی سحرانگیز فضاؤں اور برفانی ہواؤں کو اپنے جلو میں لئے یہ داستانِ محبت ان فیصلہ کن لمحوں کی رُوداد ہے جب انسان اپنا اختیار خود اپنے آپ پر سے کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی محبت اسے جن پُرخار راہوں یا نئی نویلی کہکشاؤں میں لے جانا چاہے وہ بے خودی میں اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دریائے محبت کا تیز بہاؤ اسے کسی جگہ ٹھہرنے' سوچنے' سمجھنے کا موقع دیئے بغیر اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور وہ بہتا چلا جاتا ہے۔

خوبصورت وادیوں گنگناتے آبشاروں اور حسین نظاروں کے جلو میں نمو پا کر نرم و نازک کونپل کی صورت اختیار کرنے والا جذبۂ محبت ان سرسبز وادیوں سے گزر کر میدانی علاقوں میں پہنچ کر تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔ اونچی نیچی چٹانوں کو پُرشور قوت کے ساتھ کاٹتا اور تمام رکاوٹوں کو عبور کرنے کے بعد میدانوں کی وسعتوں میں پھیل جانے والے کسی دریا کی طرح یہ جذبۂ بھی قلب و ذہن کی بیکراں وسعتوں پر حاوی آ چکا تھا۔ کسیٔ کا نام دلوں کی دھڑکن بن کر وجود کا حصہ بن چکا تھا اور پھر پہلی بار جذبۂ محبت لذت انتظار کی کیفیت سے آشنا ہوا۔ وہ انتظار جس کی کوئی حد نہ تھی۔ یہ کیفیت لمحاتی بھی ہو سکتی تھی اور ماہ و سال پر محیط بھی۔ ایک طرف جذبے کی صداقت تھی تو دوسری طرف معاشرتی رسوم و رواج میں جکڑا بندھا وہ بے معنی گریز جسے توڑنا ناممکن تھا۔ عورت ذات سے منسلک ان ناروا پابندیوں' خلافِ فطرت اور فرسودہ

عقائد کی کہانی جن کی کوئی حقیت نہیں مگر جنہیں آج کی ترقی یافتہ عورت بھی اپنے وجود کا حصہ بنائے خود کو ان پر بھینٹ چڑھانے پر آمادہ نظر آتی ہے۔

محبت وہ آفاقی جذبہ ہے جو انسان کو بیک وقت دو متضاد کیفیات سے دوچار کر دیتا ہے۔ عین اس وقت کہ جب ایک طرف یہ اپنی دھیمی دھیمی سلگتی ہوئی آنچ سے پتھر دلوں کو موم کرتا ہے تو دوسری طرف کسی تند و تیز اور پرشور انداز میں بہنے والے سرکش دریا کی طرح اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کاٹتا چھانٹتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ محبت اور فطرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چار سو بکھری فطرت اور اس کے دل رُبا نظارے اس جذبے کو مہمیز دیتے ہیں اور انسان کو بے خود کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی ہی لافانی محبت کی داستان ہے جس کا آغاز پاکستان کے فردوس منظر شمالی علاقوں میں ہوا اور پھر یہ گنگناتے جھرنوں' فلک بوس کوہساروں' خوبصورت آبشاروں کی ہمراہی میں اونچی نیچی سنگلاخ راہوں پر اپنا سفر طے کرتی رہی۔

اس کہانی کا مرکزی کردار تیمور اور فرحین انہی حسین وادیوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور پھر ان کے دلوں میں دھیمی دھیمی محبت کی ایک ایسی جوت روشن ہوتی ہے جو بجھائے نہیں بجھتی۔ آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ محبت شعلہ جوالا بن جاتی ہے۔ ایک ایسا سرکش جذبہ جو کسی رسم قسم اور بندھن کو قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پامال کرتا ہے اور دریائے کہنار کی طرح اپنے ساتھ سب کچھ بہاتا چلا جاتا ہے۔ اس کہانی کا موضوع بہت نازک ہے اور میں نے اس موضوع سے نبھانے کی اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔ اب یہ آپ دیکھیں کہ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔

طاہر جاوید مغل

فیصلہ

صبح کی سیر ہمیشہ سے میرا معمول رہا ہے۔ میں گھر سے باہر بھی ہوتا ہوں تو اس معمول میں فرق نہیں آتا۔ میں اپنے ایک دوست کے ہاں راولپنڈی میں قیام پذیر تھا۔ یہ عارضی قیام تھا یعنی صرف دو روزہ.......... اس کے بعد مجھے شمالی علاقہ جات کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ تن تنہا اور بے سمت.......... یہ تن تنہا یعنی "سولوٹور" میں پہلی مرتبہ لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی بھی میں شمالی علاقہ جات کا رخ کرتا تھا' دوست اور ہم مزاج ساتھی میرے ہمراہ ہوتے تھے' کبھی یہ تعداد ایک ہندسے کی ہوتی تھی' کبھی دوہرے ہندسے کی اور ایک مرتبہ تو یہ تہرے ہندسے تک بھی پہنچی تھی۔ شمالی علاقہ جات سے میرا عشق کوئی نئی بات نہیں۔ یہ برسوں پرانا شوق تھا اور میرے ساتھ ہی جوان ہوا تھا۔ میں نے کالج کے زمانے میں ٹریکنگ اور ہائی کنگ شروع کی تھی۔ کالج کے ہائی کنگ کلب کا میں مصروف ترین ممبر تھا۔ بعد ازاں یہ شوق آگے بڑھا اور میں نے کلائمبنگ (کوہ پیمائی) کی طرف بھی پیش قدمی کی۔ ایک معروف کلب کی ٹیم کے ساتھ میں نے کئی چھوٹی بڑی چوٹیاں سر کر رکھی تھیں۔

..........ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا راولپنڈی میں اپنے قیام کا اور صبح کی سیر کا.......... یہ میرے بس میں ہی نہیں ہوتا کہ بادصبا کا لمس پانے کے باوجود میں بستر میں پڑا رہوں۔ اس روز بھی علی الصبح میں لیاقت باغ کی طرف نکل گیا۔ میں ایک ٹریک پر جاگنگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک دراز قد نوجوان سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو میں تھوڑا سا چونکا اور رک گیا۔ مجھے نوجوان کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' نوجوان کی رفتار سست ہو گئی تھی اور وہ بھی گھوم کر میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو دونوں رک گئے۔ میں نوجوان کی طرف بڑھا۔ گورے چٹے چہرے پر دائیں کان سے نیچے ایک مسا نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں

اس ستے کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اخلاق! تم یہاں؟"
اخلاق نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ میری طرف بڑھا۔ "اوئے تیمور! مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔"

ہم دونوں بغل گیر ہوگئے۔ اخلاق میری ہی طرح دراز قد تھا۔ شانے چوڑے تھے لیکن جسم میں وہ سختی نہیں تھی جو جفاکشی اور محنت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک نہایت قیمتی ٹریک سوٹ میں تھا۔ کچھ دیر بغل گیر رہنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور سانسیں درست کرکے وہیں گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ گئے۔

"کتنا عجیب لگ رہا ہے تم سے مل کر۔" اخلاق بولا۔ "میرا خیال ہے سات آٹھ برس بعد ملاقات ہوئی ہے۔"

"ہاں' تم ان دنوں ملک سے باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہم انارکلی میں بانو بازار کے قریب ملے تھے۔"

"اور جوس کی دکان پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کی تھیں۔"

"تم نے بتایا تھا کہ پڑھائی کے سلسلے میں انگلینڈ جا رہے ہو۔ تین چار سال سے پہلے نہیں لوٹو گے۔"

"میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔" اخلاق بولا۔ "میں نے تین چار سال کا کہا تھا' تین اور چار کو ملائیں تو سات سال بنتے ہیں۔ پورے سات سال بعد لوٹا ہوں۔ ابھی دو ڈھائی مہینے ہی ہوئے ہیں۔ ایم بی اے کیا ہے بھائی' کوئی مذاق نہیں ہے۔ ایک بڑی انگلش فرم میں دو تین سالہ تجربہ بھی ہے۔ ہاں بہت سی فرمیں ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں' پُرکشش تنخواہ کی آفرز ہوئی ہیں لیکن تم جانتے ہو اپنا مزاج نوکری کا ہے ہی نہیں.......... گلبرگ لبرٹی مارکیٹ کے پاس ایک پلازہ میں پورا فلور کرائے پر لیا ہے۔ اپنا آفس بنا رہا ہوں۔ لاہور میں رہنے اور کام کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔"

"ویری نائس!" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"اور تم؟" اخلاق نے پوچھا۔

"ہم ہیں وہیں' ہم تھے جہاں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "بُرے بھلے نمبروں سے ایم ایس سی کیا تھا۔ کھیلوں کا سامان بنانے والی ایک فیکٹری میں کوالٹی کنٹرولر کی ملازمت مل گئی

تھی۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ تنخواہ بھی معقول ہے' بس گزر بسر ہو رہی ہے۔"

"رہائش کہاں ہے؟"

"وہیں' زمان پارک میں۔ والد صاحب جو مکان چھوڑ گئے تھے' اسی میں رہ رہا ہوں۔ آپا کی شادی ہوچکی ہے۔ بھائی جان اپنی فیملی کے ساتھ سعودیہ شفٹ ہوگئے ہیں۔"

"اوہ!" اخلاق کے ہونٹ افسوس ناک انداز میں سکڑ گئے۔

بات تھی بھی کسی حد تک افسوس کی۔ والد اور پھر والدہ کی وفات کے بعد میں اب یکسر تنہا تھا۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ بس ڈیڈی کے وقت کا ایک ملازم دین محمد تھا اور آیا خورشید بیگم تھی۔ کبھی کبھی تو دل میں آتی تھی کہ مکان ہی فروخت کرڈالوں۔

"آنٹی کا سن کر بہت افسوس ہوا تیمور!" اخلاق نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "مجھے پچھلے سال شاید جنوری میں پتا چلا تھا۔ بہت دل چاہا کہ اور کچھ نہیں تو تمہیں افسوس کا خط ہی لکھ دوں لیکن میرے پاس ایڈریس نہیں تھا' بلکہ کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ تو اخبار میں نیوز نہ آتی تو شاید ہمیں پتا بھی نہ چلتا۔ میں سچ کہتا ہوں تیمور' میں بہت متاثر تھا آنٹی سے۔ وہ ایک منفرد خاتون تھیں۔ ہمارے خاندان میں انہیں' ان کی حیثیت کے مطابق مرتبہ نہیں دیا گیا.......... بلکہ بڑی ناانصافی ہوئی ان سے.......... میں ہمیشہ اس صورتِ حال پر کڑھتا رہتا ہوں۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا.........." اخلاق دل گرفتہ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

ماحول ایک دم افسردہ ہوگیا تھا۔ میری والدہ کی وفات قریباً ڈیڑھ برس قبل ہوئی تھی۔ زخم ابھی بھرا نہیں تھا لہٰذا ٹیس سی اٹھنے لگی تھی۔ بہرحال میں ماحول کو مزید گمبھیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں موضوع تبدیل کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے اخلاق سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کرتا پھر رہا ہے؟

اخلاق نے جواب میں جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ایک ٹور پر نکلے ہوئے ہیں اور کل ہی لاہور سے اسلام آباد پہنچے ہیں۔ اخلاق کے ساتھیوں میں جو نام شامل تھے' وہ سب میرے جانے پہچانے تھے۔ یہ سب میرے بہت قریبی رشتے دار تھے۔ میرے خونی رشتے جو مجھ سے بہت دور ہوچکے تھے۔ میرے دونوں تایا تھے' ان کے اہلِ خانہ تھے اور اس کے علاوہ دو تین فرسٹ کزن تھے۔ اخلاق بھی ان میں شامل تھا۔ وہ میرا پھوپھی زاد

بھائی تھا۔ یہ سب لوگ ایک تفریحی دورے پر لاہور سے روانہ ہوئے تھے۔ ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے انہیں کاغان پہنچنا تھا اور پھر وہاں سے ناران اور جھیل سیف الملوک کا رخ کرنا تھا۔ واپسی پر ان کا پروگرام شوگران جانے کا تھا۔ وہاں وہ لوگ کیمپنگ کا ارادہ رکھتے تھے۔ اخلاق نے مجھے اس "دورے" کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ان کے پاس تین کاریں اور ایک اسٹیشن ویگن ہے۔ تمام سامان اسٹیشن ویگن میں لوڈ کیا گیا ہے۔ اس میں کیمپنگ کا سامان بھی شامل ہے۔ گاڑیوں میں ایک ہنڈا سوک تھی، ایک مارگلہ اور ایک مہران۔ قصہ مختصر یہ لوگ کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکلے تھے اور بلند ارادے رکھتے تھے۔ منجھلے تایا کام کے سلسلے میں لاہور ہی رہ گئے تھے۔ ہاں بڑے اور چھوٹے تایا ہمراہ تھے۔ چھوٹے تایا کا بڑا بیٹا سلجوق بزعم خود اس پارٹی کا لیڈر تھا۔ حالانکہ وہ بے چارہ خود بھی پہلی مرتبہ کاغان سے آگے جارہا تھا۔ میرے خیال میں اس پارٹی کا سب سے دلچسپ ممبر ندیم تھا۔ ندیم میرا چچا زاد تھا۔ خاندان کے دیگر افراد کی طرح، عرصہ ہوا اس سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، بہرحال اس کی لطیفہ گوئی، نغمہ سرائی اور رنگین مزاجی مجھے اب تک یاد تھی۔

گفتگو کے دوران میں ہی اخلاق کی نگاہ میری پشت پر پڑ گئی تھی۔ میں نے بھی اخلاق کی طرح ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا۔ سوٹ کی پشت پر ہائیکرز ایسوسی ایشن کے الفاظ درج تھے۔ میں پچھلے چھ برس سے اس ادارے کے ساتھ منسلک تھا اور درجنوں مرتبہ شمالی علاقوں میں دور دراز کے ٹور لگا چکا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اکیلا آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے پسندیدہ کوہ و دمن کو تنہائی میں دیکھوں۔ وہ محبوب نشیب و فراز دل فگار نظارے جن کی یاد ہمہ وقت میرے دل میں سمائی رہتی ہے، میری آنکھوں کے سامنے ہوں اور ہمارے درمیان کوئی تیسرا نہ ہو۔ میں ان بلندیوں اور ان گہرائیوں کا عاشق ہوں اور کبھی کبھی عاشق کا دل چاہتا ہے کہ وہ محبوب کے ہمراہ اکیلا ہو.......... یکسر تنہا۔

یہی وجہ تھی کہ میں خاموشی سے چلا آیا تھا۔ میں نے کسی دوست کسی شناسا کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی کہ میں "شمال" کو جارہا ہوں۔ مگر دعا کو اثر کے ساتھ، عمل کو ارادے کے ساتھ اور خواہش کو نتیجے کے ساتھ ہمیشہ سے دشمنی رہی ہے۔ یہاں بھی یہ دشمنی کار فرما ہوئی اور "دل کی تمنا دل ہی میں رہی۔" والا معاملہ ہو گیا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ اس ہائیکرز ایسوسی ایشن کے حوالے سے میری کیا مصروفیات رہی ہیں۔ وہ بے حد حیران ہوا۔ میں نے ملکہ پربت کا ذکر کیا تو وہ ششدر رہ گیا۔ ملکہ پربت جھیل سیف الملوک کے کنارے واقع ایک شاندار برفانی چوٹی ہے۔ تین سال پہلے میں نے اپنے کچھ مہم جو دوستوں کے ساتھ اسے سر کرنے کی ادھوری کوشش کی تھی۔ ناکامی کے باوجود ہمیں اپنی اس مہم پر فخر تھا۔ ہم کافی بلندی تک گئے تھے اور بخیر وعافیت واپس لوٹے تھے۔ اتفاقاً میری جیب میں ملکہ پربت والی مہم کی دو تین تصویریں بھی موجود تھیں۔ میں نے وہ تصویریں اخلاق کو دکھائیں۔

اخلاق کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں، بولا۔ "یار! ہائی کنگ اور کلائمبنگ وغیرہ کے سلسلے میں مجھے بھی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہیں۔ میں تو بہت متاثر ہوا ہوں تمہاری اچیومنٹ سے.......... ہمارے ہی خاندان میں ایک ٹھیک ٹھاک مہم جو موجود ہے اور ہمیں خبر تک نہیں.......... بھئی یہ تو کوئی بات نہیں۔ میرے خیال میں بندے کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا چاہئے اور ہر حال میں کرنا چاہئے۔ میں تو ملک سے باہر تھا۔ اگر ملک میں ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔"

"کیسا کبھی نہ ہوتا؟"

"یہی کہ ہماری فیملی میں ایک زبردست ہائیکر موجود ہو جو ملکہ پربت تک چڑھائی کر چکا ہو اور ہمیں علم تک نہ ہو۔ ویری سیڈ یار، ویری سیڈ۔" پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ "ابھی تم نے بتایا ہے کہ تم نانگا پربت کے بیس کیمپ تک بھی گئے تھے۔ یہ کس سن کی بات ہے؟"

"نائنٹی فور!" میں نے جواب دیا۔ "جاپانی ٹیم تھی، وہ لوگ تو سکہ بند کوہ پیما تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے جیسے نو آموزوں کا شامل ہو جانا بھی اعزاز کی بات تھی۔ بیس کیمپ تک کا سفر ہمارے لئے کسی بڑی مہم سے کم نہیں تھا۔"

"ونڈر فل یار.......... ایکسیلنٹ!" اخلاق نے مجھے سر تا پا گھور کر آنکھیں نچائیں۔ "یہ اپنے مستنصر حسین تارڑ صاحب بھی تمہارے جتنے دور ہی گئے ہیں بلکہ شاید اتنی دور بھی نہیں گئے پھر بھی انہوں نے کے ٹو کہانی لکھ ماری ہے اور ایسی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ تم نے کوئی کتاب نہیں لکھی؟"

"یار! کے ٹو کہانی جیسی کتاب لکھنے کے لئے مہم جو ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب ہونا بھی اشد ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں اصل شرط ادیب ہونا ہی ہے۔"

اخلاق مجھے گھور کر بولا۔ "یار' کتنے افسوس کی بات ہے' تمہارے جیسے تجربہ کار شخص کے ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک چغد کو لیڈر بنا کر پہاڑوں کی سیر کو جا رہے ہیں.......... میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے.......... اور یہ اٹل فیصلہ ہے' تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔"

"کہاں؟"

"بھئی جہاں جا رہے ہو' ہماری اور تمہاری منزل تو ایک ہی ہے۔ تمہیں بھی کاغان سے ہوتے ہوئے ناران اور سیف الملوک جانا ہے' ہمارا ٹور بھی یہی ہے۔ بس اب تو یہ فیصلہ ہوچکا۔ ہم اکٹھے سفر کریں گے اور اس ٹور کو.......... انشاء اللہ یادگار بنادیں گے۔"

اخلاق بے حد پرجوش نظر آرہا تھا۔

اسے ان فاصلوں کی کچھ زیادہ خبر نہیں تھی جو میرے اور خاندان کے دیگر لوگوں کے درمیان حائل تھے۔ یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک عرصہ سے باہر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "اخلاق صاحب' کیوں اپنے ٹور کا بیڑا غرق کرنے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ سوا ستیاناس ہوجائے گا تمہاری ساری تفریح کا۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ باقی لوگ تمہاری وجہ سے بیزاری محسوس کریں گے' ٹور کے دوران؟"

"وہ تو دور کی بات ہے بھولے بادشاہ.......... جونہی تمہارے منہ سے یہ بات نکلی کہ تم مجھ سے ملے ہو اور تم مجھے اپنے ساتھ ٹور پر لے جانا چاہتے ہو' تمہارے سارے ہمراہیوں کا منہ پھول کر کپا ہوجائے گا۔ پھر بے شک تم معذرت بھی کرلو مگر جو بدمزگی تمہاری خواہش کی وجہ سے پیدا ہوگی' وہ آخر تک تم لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" اخلاق اعتماد سے بولا۔ "میری بات ماننا ہی پڑے گی انہیں۔ بھئی اب کوئی ایویں شیویں چیز نہیں ہوں میں.......... اخلاق احمد شہزاد ایم بی اے ہوں.......... اس کے علاوہ بھی کئی ڈگریاں لگی ہوئی ہیں میرے ساتھ.......... اور خیر سے تمہارے بڑے تایا صاحب کا داماد بھی بننے والا ہوں' نرگس سے منگنی ہوچکی ہے

میری.........." اخلاق نے بڑے انداز سے گردن اکڑا کر کہا۔

یہ واقعی ایک اہم اطلاع تھی۔ میرے استفسار پر اخلاق نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ نرگس سے اس کی منگنی کب ہوئی اور شادی کب متوقع ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ "تمہاری منگنی کا سن کر خوشی ہوئی اور تمہاری یہ بات بھی درست ہے کہ تم تایا جان اور دیگر افراد پر بڑے مؤثر طریقے سے دباؤ ڈال سکتے ہو لیکن اگر میں ہی تمہارے ساتھ جانے سے انکار کردوں تو پھر؟"

اس نے چھلانگ لگا کر میری گردن دبوچ لی۔ "پھر میں تجھے اغوا کرکے لے جاؤں گا۔ اگر خود نہ کرسکا تو کرائے کے غنڈوں سے کروالوں گا۔"

قریب سے گزرتی ہوئی دو لڑکیاں ہمارے انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اخلاق نے گھبرا کر میری گردن چھوڑ دی۔

اخلاق کے ساتھ مجھے ہمیشہ سے تھوڑا بہت انس رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے تمام کزنز سے مختلف تھا۔ بے شک وہ بھی میرے دیگر رشتے داروں کی طرح خاصا خوشحال و ماڈرن تھا مگر اس میں وہ خاص قسم کی نخوت و بے گانگی نہیں تھی جو ہمارے خاندان میں ہمارے گھرانے کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اسکول اور پھر کالج کے زمانے میں بھی کئی بار اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی شادی بیاہ یا مرگ پر بھی آمنا سامنا ہوجاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت خوش اخلاقی سے ملا تھا اور اکثر اس نے ان فاصلوں پر اظہار تاسف کیا تھا جو ہمارے گھرانے اور دیگر خاندان کے درمیان موجود تھے لیکن وہ بچپن یا لڑکپن کی باتیں تھیں' ان دنوں وہ ان فاصلوں کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ انہیں مٹانے یا کم کرنے کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

اس روز لیاقت باغ کے سبزہ زار میں ہم قریباً دو گھنٹے تک مصروفِ گفتگو رہے یہاں تک کہ صبح کی ڈولی رخصت ہوگئی اور سورج نے ہر طرف کرنوں کا جال بچھادیا۔ اخلاق نے مجھ سے میرا پتا ٹھکانا دریافت کرلیا تھا اور اپنا ایڈریس بھی دے دیا تھا۔ اگلے دن مجھ سے ملنے کا پختہ عہد کرکے وہ واپس چلا گیا۔

اس نے اگلے روز آنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ شام کو ہی پھر آدھمکا۔ "یار' تیرا ایڈریس ڈھونڈنے میں دانتوں پسینہ آگیا۔" وہ دانتوں کے بجائے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے

بولا۔

میں اسے اندر لے آیا۔ "تمہیں تو کل آنا تھا۔"

"وہ گانا نہیں سنا تم نے' بے خودی میں صنم۔ اٹھ گئے جو قدم۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کل تک کہیں اِدھر اُدھر نہ کھسک جاؤ۔"

"اگر کھسک جاتا تو کیا ہوتا؟"

"میرے سارے پروگرام کا کریا کرم ہو جاتا۔ بھئی میں پکا فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ جس ٹور پر ہم جا رہے ہیں وہ تمہارے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔"

"میرا ناقص خیال ہے کہ تم نے ابھی تک اپنے ہم سفروں اور خصوصاً بڑے تایا جان سے بات نہیں کی۔"

"کر چکا ہوں بھئی' اس لئے تو آیا ہوں۔"

"یعنی وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔" میں نے بے حد حیرت کا اظہار کیا۔

"گھامڑ! میں نے انہیں آمادہ کر لیا ہے۔"

"آمادہ کرنے اور آمادہ ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تم نے ایک ہونے والے داماد کی حیثیت سے ان پر دباؤ ڈالا ہو گا۔ ان کے پاس تمہاری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہو گا۔"

"چلو ایسے ہی سہی' لیکن میں تمہیں ساتھ لئے بغیر جاؤں گا نہیں۔ اگر تم نہیں گئے تو سمجھو یہ ٹور بھی ختم ہو جائے گا۔ بھئی' میرے لئے یہ بات کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں کہ تم جیسے تجربہ کار ہائیکر کے ہوتے ہوئے ہم سلجوق جیسے چغد کو پارٹی لیڈر بنائیں اور اس کی زیرِ نگرانی ٹریکنگ اور کیمپنگ وغیرہ کریں۔ اِٹ اِز امپوسیبل' تمہیں چلنا ہی ہو گا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم صرف اپنا تفریحی دورہ برباد کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں ٹھیک سے معلوم نہیں کہ تایا صاحبان اور ان کے اہلِ خانہ مجھے کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میری موجودگی میں انہیں یہی محسوس ہو گا کہ وہ کسی بڑے ڈکیت یا عالمی شہرت یافتہ قاتل کے ساتھ تفریح پر نکلے ہوئے ہیں اور اس حماقت کے نتیجے میں کسی بھی وقت ان کے جان

ومال کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ' جب جان ومال و آبرو کو شدید خطرات لاحق ہوں تو تفریح کیا خاک ہو گی!"

"مگر وہ لوگ تمہیں ایسا کیوں سمجھتے ہیں جب کہ تم ایسے نہیں ہو۔"

"یہ بات تم ان سے پوچھو تو بہتر ہے۔"

"پھر بھی تمہیں کچھ اندازہ تو ہو گا۔"

"میرے خیال میں میری سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ مجھ میں منافقت نہیں ہے۔ میں سگریٹ پیتا ہوں' کبھی کبھار ڈرنک بھی کرتا ہوں۔ میرے دوستوں میں بھلے مانس بھی ہیں اور ایسے بھی ہیں جو بھلے مانس نہیں ہیں۔ آوارگی میرا شوق ہے اور میں ایسی شرافت پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں جس کی اصل بزدلی پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں اپنے حق کے لئے لڑنے کی بات ہو' میں پیچھے نہیں ہٹتا ہوں۔ اب تم میری ان خصلتوں کو برائی کہہ لو' بے راہ روی کہہ لو یا کوئی اور نام لے لو لیکن یہ میری ذات کا حصہ ہیں اور میں نے کبھی بھی انہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے خاندان سے باہر ہوں اور تمہارے بڑے چھوٹے مجھے منہ نہیں لگاتے ہیں۔ یقینی بات ہے کہ تمہاری زبان سے میرے بارے میں سن کر ان کا خون کھول اٹھا ہو گا۔ اب پتا نہیں انہوں نے اپنے دلی جذبات تم پر ظاہر کیے ہیں یا نہیں لیکن دل ہی دل میں وہ سب تمہیں کوس رہے ہوں گے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔"

ہمارے درمیان قریباً ایک گھنٹے تک بحث ہوئی۔ اخلاق اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ وہ ٹریکنگ اور ہائی کنگ کے سلسلے میں میرے تجربے سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ دوسرے بھی اس سے متاثر ہوں لہٰذا وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے وہ مجھے میرے اسباب سمیت اسی ہوٹل میں لے گیا جہاں چھوٹے بڑے تایا کی فیملیز ٹھہری ہوئی تھیں۔ خلافِ توقع سب لوگ خوش دلی سے ملے' یہاں تک کہ بڑے تایا جان کے ماتھے پر بھی ناگواری کی بس ایک دو شکنیں ہی نظر آ سکیں۔ میں قریباً پانچ سال بعد ان لوگوں سے مل رہا تھا۔ سب چہرے بدلے بدلے نظر آ رہے تھے۔ بچپن اب لڑکپن میں ڈھل گیا تھا۔ جو لڑکے تھے وہ اب جوان نظر آ رہے

تھے' جو عمر رسیدہ تھے وہ اب مزید عمر رسیدہ ہو گئے تھے۔ مزید عمر رسیدہ ہونے والوں میں بڑے تایا احتشام اور بڑی تائی نصرت شامل تھیں۔ تاہم چھوٹی تائی اور چھوٹے تایا صحت مند نظر آتے تھے۔ دونوں کافی فربہ اندام بھی تھے۔ لگتا تھا کہ کھانے پینے کے دونوں زبردست شوقین ہیں۔ بڑے تایا کی چھوٹی بیٹی یعنی نرگس کی چھوٹی بہن عینی اب جوان ہو گئی تھی۔ تراشیدہ بالوں اور ماڈرن لباس کے ساتھ وہ خاصی دلکش نظر آ رہی تھی۔ بڑے تایا کے گھرانے میں ایک بہو کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ خاموش طبع سی اس جواں سال خاتون کا نام فرحین تھا۔ بڑے تایا کا بیٹا رضوان بھی ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹے تایا کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں بھی اس گروپ میں شامل تھیں۔ یہ ہنستے مسکراتے روشن چہرہ' تعلیم یافتہ اور ماڈرن لوگوں کا گروپ تھا۔ تعلیم یافتہ اور ہنس مکھ تو کسی حد تک میں بھی تھا لیکن شاید ان لوگوں کی طرح ماڈرن نہیں تھا یا پھر کوئی اور کمی تھی مجھ میں کہ میں خود کو ان کا ہم پلہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان لوگوں میں پہنچ کر میں نے عجیب طرح کی بے چینی محسوس کی لیکن جس طرح وہ اپنی ناگواری چھپائے ہوئے تھے اسی طرح میں نے بھی اپنی بے چینی چھپائے رکھی کہ ایک اچھے سفر کے لئے یہ تھوڑی سی منافقت ضروری ہو گئی تھی۔

۲۲ جون کے روز ہم دس بجے کے قریب راولپنڈی سے کاغان کے لئے روانہ ہوئے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ قافلہ چار گاڑیوں پر مشتمل تھا اور ان میں ایک بڑی اسٹیشن وین بھی تھی۔ اسٹیشن وین میں سازوسامان کے علاوہ تین چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش بھی تھی۔ میں مہران گاڑی میں اپنے پھوپھی زاد بھائیوں کے ساتھ بیٹھنا چاہ رہا تھا لیکن اخلاق نے زبردستی مجھے اپنے ساتھ مارگلہ گاڑی میں بٹھایا۔ اس گاڑی میں رضوان کے علاوہ میرا چچا زاد ندیم بھی سوار تھا۔ وہ زبردست قسم کا لطیفہ گو اور خوش نوا شخص تھا۔ اخلاق کے بعد ندیم ہی تھا جس نے اس گروپ میں میری آمد کو ٹھنڈے پیٹوں قبول کیا تھا۔ ندیم کی موجودگی کے سبب سفر اچھا کٹتا رہا۔ موسم بھی خوش گوار تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ دوپہر کا کھانا ایبٹ آباد پہنچ کر ہی کھایا جائے گا لیکن راستے میں دو تین جگہ گاڑیوں کے ٹائر پنکچر ہوئے۔ ہم قریباً ایک بجے حسن ابدال پہنچ پائے۔ حسن ابدال میں لبِ سڑک تین چار ہوٹل کھانے کے حوالے سے بڑے مناسب ہیں۔ میرے مشورے پر کھانا وہیں کھالیا گیا۔ اس کے بعد ہم ایبٹ آباد روانہ ہوئے۔ ابھی ہم ہری پور سے کچھ ہی آگے گئے تھے کہ

عجیب واقعہ رونما ہوا۔ میرے بائیں پہلو میں درد ہونا شروع ہو گیا۔ درد کی نوعیت اور اٹھان محسوس کر کے ایک دم میرے مساموں سے پسینہ بہنا شروع ہو گیا۔ میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ یہ گردے کا درد ہے۔ گردے کا درد مجھے دو تین بار پہلے بھی ہو چکا تھا لہٰذا مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ کس "بلا" کا نام ہے۔ پچھلے چھ سات سال سے یہ درد بالکل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ہری پور سے ایبٹ آباد کی طرف جاتے ہوئے جب یہ درد اچانک شروع ہوا تو میرے ذہن میں کسی ایسے آتش فشاں کا خیال آیا جو برسوں سے خاموش تھا اور اب اچانک انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ شروع میں تو میں نے خود کو فریب دینے کی کوشش کی اور دل کو سمجھایا کہ یہ کوئی اور درد ہو گا۔ گاڑی میں کولر موجود تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے تین چار گلاس پانی پیا اور جیلوسل کی کئی گولیاں حلق سے نیچے اتاریں لیکن جلد ہی بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق درد ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس درد سے بڑھ کر یہ احساس ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ یہ درد اب آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ پانچ دس منٹ کے اندر میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا اور میری حالتِ زار دیکھتے ہوئے اخلاق کو گاڑی روکنی پڑی۔ جونہی ہماری گاڑی رکی' باقی بھی رک گئیں۔ جلد ہی یہ خبر پورے گروپ کو معلوم ہو گئی کہ مجھے گردے کا شدید درد ہو رہا ہے۔ درد کی اذیت کے ساتھ ساتھ اب ایک عجیب سی پشیمانی بھی دل ودماغ پر حاوی ہو رہی تھی۔ میری وجہ سے سب لوگ ڈسٹرب ہو گئے تھے۔

میں دل ہی دل میں خود کو اور اپنے نامراد گردے کو کوس رہا تھا۔ پچھلے چھ سال میں کیسے کیسے مشکل حالات میں کتنے کٹھن سفر کئے لیکن گردے نے ذرا اثر قبول نہ کیا۔ اب ایک آسان اور آرام دہ سفر کے دوران میں اس کا فیوز اڑ گیا تھا.......... میں نے بہت کہا کہ درد ایسا شدید نہیں' ہم سفر جاری رکھ سکتے ہیں لیکن اخلاق کی تیز نظر میرے اندر تک دیکھ رہی تھی۔ اس نے نادر شاہی فیصلہ جاری کر دیا کہ ایبٹ آباد میں قیام کیا جائے۔ یہ تو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ نہایت روشن مستقبل والے داماد صاحب کی بات ٹالنا بڑے تایا جان کے لئے آسان نہیں ہے۔ اب اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد تایا جان نے اخلاق کی ہاں میں ہاں ملادی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود

بڑی تائی جان کی طبیعت بھی کچھ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ ان کا دل مسلسل متلا رہا تھا اور وہ بار بار مولی کا نمک چاٹتی نظر آ رہی تھیں۔ جب بڑے تایا جان نے اخلاق کی ہاں میں ہاں ملائی تو باقی گروپ کو بھی چاروناچار یہ بات ماننی پڑی۔

ویسے بھی سب لوگوں کو کہیں منزل پر تو پہنچنا نہیں تھا۔ یہ سیر و سیاحت کا ٹور تھا اور ایسے ٹورز پر ہر خوبصورت مقام' منزل ہوتا ہے۔ گروپ کی لڑکیوں کو خاص طور سے "شملہ ہل" دیکھنے کا شوق تھا۔ بڑے تایا اور رضوان وغیرہ نے الیاسی مسجد نہیں دیکھی تھی۔ غالباً انہوں نے دل ہی دل میں سوچا ہوگا کہ گردے کے درد کا احترام بھی ہو جائے گا اور ایبٹ آباد کی سیاحت بھی ہو جائے گی۔ جلد ہی سب نے بیک زبان کہا کہ آج رات ایبٹ آباد میں قیام کیا جائے۔ قرعہ فال ایبٹ آباد کے کشمیر ویو ہوٹل کے نام نکلا۔ رضوان وغیرہ پہلے بھی اس ہوٹل میں ٹھہر چکے تھے۔ اچھا ہوٹل تھا' بارونق علاقہ تھا۔ ایک طویل بالکونی تھی جس پر سامنے کی طرف سیمنٹ کے خوبصورت ستون بنے ہوئے تھے۔ ان تین چار فٹ اونچے ستونوں کے ساتھ ساتھ کرسیاں اور میزیں رکھی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر نیچے بازار کی رونق اور پہاڑوں کے مناظر دیکھنا بھلا معلوم ہوتا تھا لیکن میرے پہلو میں چونکہ درد کا خنجر پیوست تھا للذا میں ہوٹل اور اردگرد کی خوبصورتی پر بالکل نگاہ نہیں ڈال سکا۔

چار کمرے بک کرائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈبل بیڈ کا چھوٹا کمرا تھا۔ یہ اخلاق نے میرے لئے حاصل کیا تھا۔ وہ مجھے کمرے میں لے آیا اور تندہی سے میری تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ میں نے درد کش گولیاں کھائیں' دل میں موہوم سی امید تھی کہ شاید درد میں افاقہ ہو جائے لیکن جب ایک ڈیڑھ گھنٹے تک یہ امید پوری نہیں ہوئی تو اخلاق مجھے ایک نزدیکی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا۔ دوا دی اور گلوکوز کی ڈرپ تجویز کی۔ میری کزنز.......... میں سے بڑے تایا کی بیٹی عینی میڈیکل کر رہی تھی اور فائنل ایئر میں تھی۔ اس نے مجھے انجکشن اور ڈرپ وغیرہ لگانے کی ذمے داری قبول کر لی۔

اس رات اخلاق صبح تک میرے ساتھ جاگتا رہا۔ وہ رات مجھ پر بھاری بھی بہت تھی۔ درد کسی پہلو چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اوپر سے قے بھی شروع ہو گئی تھی۔ عینی نے بڑی دل جمعی سے میری دیکھ بھال کی۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی اور میں سخت تکلیف کے عالم میں بھی اس کی خوبصورتی کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ رات بارہ بجے کے لگ

بھگ بازو ہلنے کی وجہ سے میری نس میں لگی ہوئی ڈرپ کی سوئی ہل گئی اور دوبارہ سوئی لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ معلوم نہیں کیوں نس نہیں مل رہی تھی۔ عینی نے بازو پر تقریباً دس جگہ کوششیں کی لیکن سوئی نہیں لگ سکی۔ ہر بار جب وہ سوئی میرے بازو میں چبھوتی تو میرے بجائے اس کے منہ سے سی نکل جاتی۔ اذیت کی حالت میں بھی اس کی یہ ادا مجھے بھلی لگ رہی تھی۔ وہ ایک خوش بودار لڑکی تھی۔ اس کا قرب' اس کے نازک ہاتھوں کا لمس میری تکلیف کی شدت کو کم کر رہا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب اخلاق کمرے سے باہر تھا اور وہ میرے اوپر جھکی ہوئی مجھے دوا پلا رہی تھی' اس کی بھابی فرحین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر جو پہلا تاثر نظر آیا۔ وہ ناخوش گواری کا تھا۔ اس نے عینی سے کہا۔ "عینی' رات بڑی ہو گئی ہے' چلو اب سو جاؤ۔"

عینی بولی۔ "بس بھابی! دو بجے ایک انجکشن لگنا ہے' وہ لگا کر آجاتی ہوں۔"

"بھئی انجکشن کا کیا ہے' اخلاق لگا لے گا۔" فرحین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"نس کا انجکشن ہے بھابی! مجھے ہی لگانا پڑے گا۔"

فرحین لاجواب ہو کر واپس چلی گئی۔ میں نے کہا۔ "عینی! تمہاری بھابی بڑی رعب دار ہیں۔"

"بھابی کس کی ہیں۔" وہ مسکرائی۔ چند لمحے محویت سے مجھے تکتی رہی پھر بولی "تیمور بھائی! مجھے ٹریکنگ اور ہائی کنگ سے بڑا لگاؤ ہے۔ میں ایسی خبریں شوق سے پڑھتی ہوں۔ ایک مرتبہ اخبار میں آپ کے بارے میں ایک نیوز پڑھی تھی میں نے.......... آپ شاید کسی ٹیم کے ساتھ صفائی کی مہم پر نانگا پربت کے دامن تک گئے تھے۔ گروپ لیڈر کے ساتھ آپ کی تصویر بھی آئی تھی۔"

"ہاں' یہ ۹۲ء کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کافی مشکل سفر تھا۔ اس جیسے اور بھی سفر کئے ہیں میں نے لیکن دیکھو' یہ گردے کا منحوس درد شروع ہوا تو کیسے آسان سفر پر ہوا۔ اب کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آئے گی۔"

وہ مسکرائی۔ "ویسے تیمور بھائی' آپ دلچسپ آدمی ہیں اور اتنے برے بھی نہیں جتنا ہمارے خاندان میں آپ کو سمجھا جاتا ہے۔"

"تو کتنا برا ہوں؟"

"تھوڑے تھوڑے۔" اس نے ادا سے کہا۔ "آپ سگریٹ بہت پیتے ہیں' آپ کی مونچھیں کچھ بڑی ہیں۔ آپ لباس کے معاملے میں بڑے بے پروا نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ آپ باتوں میں بازاری قسم کے لفظ استعمال کرجاتے ہیں۔ شاید آپ کو خود بھی پتا نہیں چلتا ہے۔"

"یہ تو پھر کافی برائیاں ہوگئیں۔"

"نہیں.......... سنا تو آپ کے بارے میں بہت کچھ ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ! آخر آپ لوگ میرے بارے میں اتنے بدظن کیوں ہیں' کیا تمہاری سمجھ میں اس کی کوئی وجہ آتی ہے؟"

اس نے پُرسوچ انداز میں اپنی انگلی پیشانی سے ٹکائی اور بولی۔ "دل کی بات بتاؤں یا ٹالنے کی کوشش کروں؟"

"دل کی بات بتاؤ۔ اس پوری پارٹی میں اخلاق اور تم ہی مجھے کچھ اپنے اپنے سے لگے ہو۔ اس لئے تم سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ بات کررہا ہوں۔"

"تیمور.......... بھائی! میرے خیال میں اس بدظنی کی اصل وجہ آپ کی ذات کے بجائے آپ کے "پس منظر" میں پوشیدہ ہے۔ آپ کی والدہ خاندان سے باہر کی تھیں۔ پھر یہ شادی بھی چچا جان کی پسند کی تھی۔ ہمارا خاندان آپ کی والدہ کو اپنے اندر سمو نہیں سکا۔ یقیناً اس میں آپ کی والدہ سے زیادہ ہمارے خاندان کا قصور ہے۔ بہرطور آپ اپنے اور ہمارے درمیان جو فاصلہ پاتے ہیں اس کی بنیاد ماضی کے اس واقعے پر رکھی گئی ہے۔"

ہم تادیر اس معاملے پر گفتگو کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے انجکشن کا وقت ہوگیا۔ عینی نے انجکشن لگایا ہی تھا کہ اس کی بھابی فرحین پھر آدھمکیں۔ "لگالیا انجکشن؟" انہوں نے پوچھا۔

عینی نے اثبات میں سرہلایا اور مجھے الوداعی نظروں سے دیکھ کر بھابی کے ساتھ چلی گئی۔ تاہم جاتے جاتے وہ اخلاق کا پاؤں زور سے ہلاگئی۔ اخلاق میرے ساتھ والے بستر پر سویا پڑا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رات کا باقی حصہ اخلاق نے بھی میرے ساتھ جاگ کر گزارا۔

اگلے روز بھی وقفے وقفے سے شدید درد اٹھتا رہا۔ کچھ کھایا پیا نہیں جارہا تھا۔ اخلاق

نے اعلان کردیا تھا کہ جب تک تیمور پوری طرح ٹھیک نہیں ہوجاتا' کوئی آگے جانے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ رہا تھا کہ جو بھی سامان خوردونوش لاہور سے لایا گیا ہے یعنی دالیں' چاول' بیکری اور جام چٹنیاں وغیرہ وہ سب یہیں ایبٹ آباد میں رہ کر استعمال کرلیا جائے اور آٹھ دس روز یہاں قیام کرنے کے بعد واپس لاہور کا رخ کیا جائے۔ درحقیقت میری تکلیف نے اسے سخت پریشان کردیا تھا اور اس سے زیادہ پریشانی کی بات اخلاق کے لئے یہ تھی کہ میری شدید تکلیف دیکھنے کے باوجود پارٹی کے باقی ممبران جلد از جلد ناران کی طرف روانہ ہونا چاہتے تھے۔ ان میں سے چند ایک نے اخلاق کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ میرے اہل خانہ کو میری بیماری کی اطلاع لاہور میں بذریعہ فون دے کر میرے فرض سے سبکدوش ہوا جائے اور پروگرام کے مطابق سفر جاری رکھا جائے۔ سلجوق یہ مشورہ اخلاق کے سامنے بار بار دہرا چکا تھا۔ اپنی حالت کے پیش نظر میں نے بھی بارہا اخلاق سے کہا تھا کہ وہ میری وجہ سے اپنا ٹور خراب نہ کرے۔

اخلاق بھی ایک ضدی تھا' وہ اس بات پر اڑ گیا تھا کہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا چاہے سارا پروگرام ہی کینسل کرنا پڑے۔ اس کے دوٹوک فیصلے نے سب کو رویہ بدلنے پر مجبور کردیا تھا۔ اب وہ دل و جان سے اس بات کے خواہش مند نظر آنے لگے تھے کہ میری تکلیف میں جلد از جلد افاقہ ہو تاکہ ناران کی طرف سفر شروع کیا جائے.......... بڑی تائی کی طبیعت اب بحال تھی.......... بڑی تائی کے پُرزور اصرار پر اخلاق سہ پہر کے وقت مجھے دوبارہ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر گلوکوز کی ڈرپ لگائی۔ اس ڈرپ نے کرشماتی اثر کیا۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ میں چار پانچ روز سے پہلے ٹھیک ہوسکوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اخلاق کی منتیں کرتا رہا تھا کہ وہ میری وجہ سے اپنا ٹور خراب نہ کرے لیکن اس ڈرپ کے لگنے کے بعد ہی میں نمایاں افاقہ محسوس کرنے لگا۔ طبیعت ٹھیک ہو تو کس کا دل مسکرانے کو نہیں چاہتا اور کون نہیں چاہتا کہ وہ ایک خوبصورت ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھے اور ایبٹ آباد کے سرسبزوشاداب پہاڑوں کو دیکھتا رہے اور ان کھلی ہواؤں کو سینے میں اتارتا رہے جو نتھیا گلی اور مری کی یخ بستہ بلندیوں کو چھو کر آتی ہیں۔ ایک دم ہی مجھے اپنا گردوپیش ایک حسین منظر نظر آنے لگا تھا۔ بالکونی کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک' سامنے تندور پر مسلسل روٹیاں پکاتا ہوا نان بائی' فوٹوگرافر کی دکان پر

آتے جاتے ہوئے لوگ' چوک کے فوارے سے چھوٹتا ہوا پانی اور عینی............ وہ واقعی ایک دلکش کزن تھی اور اس کے لمس میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس کا ہاتھ بدن سے چھوتے ہی گردے کی شدید تکلیف نصف رہ جاتی تھی۔ وہ میرے پاس سے گزری تو میں نے کہا۔ "عینی! تم کڈنی اسپیشلسٹ بننا۔"

"وہ کیوں؟"

"تمہارے اندر کوئی ایسی بات ہے کہ جب تم پاس آتی ہو تو انسانی گردے میں ایک خاص قسم کی کیمیائی تبدیلی واقع ہوجاتی ہے اور اس کی تکلیف کم ہوجاتی ہے۔"

"آپ اپنی مثال کو پوری انسانیت پر لاگو کیوں کر رہے ہیں؟"

"کیوں' ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟"

"ہوسکتا ہے کہ آپ کا گردہ خاص قسم کا ہو۔"

"کیا مطلب' گردوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟"

"کیوں نہیں' نرم گردہ............ سخت گردہ............ دل پھینک گردہ............"

............اس روز سہ پہر تک میری طبیعت کافی سنبھل گئی۔ پروگرام بنا کہ سب لوگ شملہ پہاڑی چلیں گے اور میں بھی ساتھ چلوں گا۔ شملہ پہاڑی قابلِ دید جگہ ہے۔ ایبٹ آباد کی آبادی سے صرف ڈھائی تین کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ مسلسل چڑھائی ہے۔ تھوڑی بلندی پر جائیں تو ایبٹ آباد کی ساری آبادی نظر آنے لگتی ہے۔ ٹاپ پر موسم بھی نسبتاً خنک ہوتا ہے اور چیڑ کے بلند وبالا درختوں میں ہوا ایک گونج کے ساتھ سرسراتی ہوئی گزرتی ہے۔ میں ایک دو بار پہلے بھی اس پارک میں آچکا تھا لیکن اس روز کچھ زیادہ ہی لطف آیا۔ قریباً ۲۴ گھنٹے کی شدید تکلیف کے بعد آرام وسکون کے یہ لمحات بہت بھلے لگ رہے تھے۔ کسی دانا نے سچ کہا تھا کہ خوشی کو آرام میں نہیں تکلیف میں تلاش کرنا چاہئے۔

اگلے روز میری طبیعت میں مزید بہتری آئی۔ اخلاق کا اصرار تھا کہ میں ایک دن مزید آرام کرلوں کیونکہ ایبٹ آباد سے آگے کا سفر خاصا دشوار ہوگا۔ اس کی بات تکنیکی طور پر درست تھی۔ دردِ گردہ اور سفر کا چولی دامن کا ساتھ سمجھا جاتا ہے لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ میری وجہ سے سارے گروپ کا پروگرام درہم برہم ہو۔ میں نے اخلاق کو اپنی "فٹ نس" کا مکمل یقین دلایا اور اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ میں پوری طرح سفر

کے قابل ہوں۔ مگر اس موقع پر گروپ کے باقی ارکان خاص طور سے نوجوان کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ دراصل ایبٹ آباد میں ان کا دل کچھ لگ گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مزید ایک روز قیام کرکے شہر کی قابلِ دید جگہیں دیکھ لی جائیں۔ مثلاً کمپنی باغ' الیاسی مسجد وغیرہ۔

ہم اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ ایبٹ آباد سے عازم کاغان ہوئے۔ یہ جمعے کا روز تھا۔ موسم خوش گوار تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گردے کے مریض کو پانی بکثرت پلایا جاتا ہے لہٰذا عینی کی ہدایت پر اخلاق نے چھ لیٹر کا واٹر کولر لبالب بھر کر میرے پہلو میں رکھ دیا تھا اور حکم جاری کردیا تھا کہ میں ہر آدھے گھنٹے بعد ایک گلاس بھر کر معدے میں انڈیلتا رہوں۔

میں نے کہا۔ "حضرت اخلاق صاحب' اتنا مت چاہو کہ دم نکل جائے۔ اتنا زیادہ پانی پینے سے گردے کے درد کا چانس تو شاید ختم ہوجائے لیکن زندہ رہنے کا چانس بھی مشکوک ہوجائے گا۔"

ہنستے کھیلتے سفر جاری رہا۔ ندیم کی خوش گفتاری بہت کام آرہی تھی۔ ہم نے مانسہرہ سے پیٹرول لیا۔ جونہی گاڑیاں شاہراہ ریشم کو چھوڑ کر کاغان کی طرف مڑیں' سڑک تنگ ہوگئی اور راستہ غیر ہموار ہوگیا۔ جگہ جگہ سڑک کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ گرد وغبار' تپش اور کچے پکے راستوں پر اچھلتی کودتی گاڑیاں' گروپ کے سارے ارکان ایک دم بجھے بجھے سے نظر آنے لگے۔

اخلاق بولا۔ "یار! شروعات تو کچھ اچھی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا۔ "شروعات اچھی ہے۔ اختتام دیکھ لو گے تو پھر شروعات پر تبصرہ کرنا۔ وہ شعر نہیں سنا تم نے' انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ' میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے۔ تم سمجھو کہ یہ شعر جھیل سیف الملوک نے اپنے عاشقوں کے لئے کہا تھا۔"

ندیم موسیقی کا بہت شوقین تھا۔ اس کا ہاتھ بار بار گاڑی کے ڈیک کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اخلاق ڈرائیونگ کرتے کرتے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹادیتا تھا۔ "یار ندیم! خدا کا خوف کرو۔ اتنا برا راستہ ہے اور تمہیں گانوں کی پڑی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو تم جھیل سیف الملوک کے کناروں تک ڈیک کو آن نہیں

کرسکو گے۔ بھئی یہ راستے بس اسی قسم کے ہیں۔ جوں جوں آگے بڑھیں گے یہ خراب تر ہوتے جائیں گے۔ تم راستے کی کوالٹی کو نظرانداز کر کے مناظر کی کوالٹی پر توجہ دو۔"

پندرہ بیس کلومیٹر کا سفر اسی طرح گرد وغبار میں اچھلتے کودتے گزرا۔ جہاں کہیں ہموار سڑک آتی سب چیخ اٹھتے۔ "آگئی پکی سڑک۔"

مگر ابھی اس چیخ وپکار کی گونج بھی ختم نہ ہونے پاتی تھی کہ سڑک ناپید ہو جاتی۔ بہرحال آگے جا کر راستہ ٹھیک ہوگیا۔ جس وقت ہم بالاکوٹ کے خوبصورت قصبے کے درمیان سے گزرے' ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بالاکوٹ کے نشیب وفراز میں گونجتے اور دھاڑتے ہوئے آبی نالوں کا نظارہ دل کش تھا۔ آبی گزرگاہوں کا ماخذ دریائے کنہار تھا جو آئندہ سفر میں ہمارا ہم سفر ٹھہرنے والا تھا۔

میں جب بھی بالاکوٹ سے گزرتا ہوں بچپن کی چند خوبصورت یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ والد صاحب ایک دفعہ ہم بہن بھائیوں کو لے کر یہاں آئے تھے۔ ہم خاص طور سے مولوی اسمٰعیل شہید کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے تھے۔ راستے میں ہم نے پودینے کی بہتات دیکھی تھی۔ خودرو گھاس کی طرح حدِ نگاہ تک پودینا بچھا تھا۔ ہمارے معصوم ذہنوں نے تصور ہی تصور میں اس پودینے کو گٹھیوں کی صورت میں جوڑا تھا اور حساب لگایا تھا کہ کتنے ہزار کا پودینا ان پہاڑوں پر اگا ہوا ہے۔ پھر والد صاحب کے ہمراہ ہمارا گزر ایک میدان سے ہوا تھا۔ میدان کی ڈھلوان پر بڑی بڑی سیاہ چٹانیں تھیں۔ والد صاحب بڑی محویت سے اس میدان کو تکتے رہے تھے۔ وہ تصور کی نگاہ سے جیسے ماضی بعید کا کوئی بھولا بسرا منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ ہمیں بتانے لگے کہ اس میدان میں اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں نے قابض انگریزوں کے خلاف یادگار جنگ لڑی تھی۔ یہی وہ دیوہیکل چٹانیں تھیں جنھوں نے سرفروشوں کی ناقابلِ فراموش مزاحمت دیکھی تھی۔ وہ ایک پتھر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔ "یقیناً انہی پتھروں کی اوٹ میں بیٹھ کر رائفل بردار مجاہدین نے فرنگیوں پر تابڑتوڑ فائرنگ کی ہوگی۔"

میری ایسی ہی کئی چھوٹی چھوٹی یادیں بالاکوٹ سے وابستہ ہیں۔ اسی بالاکوٹ میں کوئی ایسی مسجد ہے جس کا نام ومقام مجھے معلوم نہیں۔ اس مسجد کے اندر ایک تیز رو آبِ جو بہتی ہے' نمازی وہاں سے وضو کرتے ہیں۔ ہم والد صاحب کے ساتھ اس مسجد میں گئے

تھے۔ والد صاحب نماز میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہم ایک دلچسپ کھیل کھیلنے لگ گئے تھے۔ میرا ایک کزن اکبر اپنی چپل تیز رفتار آبِ جو میں پھینکتا تھا' دوسرے ساتھی نشیب میں کھڑے رہتے تھے۔ جب چپل تیرتی ہوئی وہاں پہنچتی تھی تو وہ اسے نکال لیتے تھے۔ یہ کھیل بمشکل چار منٹ ہی جاری رہ سکا تھا۔ تیز رفتار پانی میں چپل ہاتھ نہیں آسکی تھی اور دریائے کنہار میں پہنچ گئی تھی۔ نتیجے میں اکبر کو اپنے گال پر اباجی کا طمانچہ سہنا پڑا تھا۔ ایسی ہی کئی یادیں بالاکوٹ کے گلی کوچوں میں گم ہیں۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں وہ مجھے پکارتی ہیں۔ شاید کسی روز مجھے ان کی پکار پر بالاکوٹ رکنا پڑے اور اس کے گلی کوچوں میں بھٹکنا پڑے.......... پھر شاید.......... شاید مجھے وہ اپنی خوبصورت ٹینس بال بھی مل جائے جو میں نے ایک مسجد کے وضو خانے میں گیلے ٹاٹ کے ڈھیر تلے رکھ دی تھی اور بھول گیا تھا۔ بیس سال پہلے اپنی اس بال کی گمشدگی پر میں کئی روز پریشان رہا تھا۔

بالاکوٹ سے آگے سفر بہت خوش گوار رہا۔ سوائے ایک واقعے کے' مارگلہ گاڑی ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ اس میں چھوٹے تایا کی فیملی سوار تھی۔ گاڑی چھوٹے تایا کا بیٹا سلجوق چلا رہا تھا۔ یہ گاڑی بالکل نئی لی گئی تھی۔ خطرناک ڈھلوان پر گاڑی چلاتے ہوئے سلجوق نے کاریگری دکھائی اور گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ انجن بند ہوتے ہی گاڑی کا ہائیڈرولک سسٹم کام کرنا چھوڑ دے گا اور اس کے ساتھ ہی اسٹیئرنگ بھی لاک ہو جائے گا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سات آٹھ سو فٹ گہری کھڈ کی طرف جا رہی تھی۔ اس موقع پر میں نے بھی گاڑی کو خطرناک رفتار سے موڑ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ خدا کو گاڑی سواروں کو زندہ رکھنا منظور تھا' عین موقع پر سلجوق کا دماغ کام کر گیا اور اس نے اگنیشن میں چابی گھما کر اسٹیئرنگ آزاد کرالیا۔ گاڑی سات سو فٹ گہری موت کے کنارے پر پہنچ کر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئی۔

شروع میں ہمارا ارادہ یہ تھا کہ آج ناران پہنچ کر ہی دم لیں گے مگر راستے اتنے خراب تھے کہ سارا پروگرام اپ سیٹ ہو گیا۔ سہ پہر دو بجے تک ہمیں کاغان کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ بہرحال دریائے کنہار ہمارے ساتھ ساتھ تھا اور ہمیں یقین دلا رہا تھا کہ کاغان آئے گا اور ناران آئے گا اور بالآخر جھیل سیف الملوک بھی آئے گی۔ کاغان سے آگے ناران صرف ۲۲ کلومیٹر ہے لیکن یہ راستہ مزید دشوار ہے۔ لہٰذا فیصلہ یہ

ہوا کہ اپنے نڈھال جسموں اور تھکی ماندی گاڑیوں کو مزید گھسیٹنے کے بجائے بہتر ہے کہ رات کاغان میں گزار لی جائے۔

خدا خدا کرکے چار بجے کے لگ بھگ کاغان پہنچے۔ اچھلتے، کودتے اور دھاڑتے دریا کے کنارے یہ ایک نہایت خوبصورت قصبہ ہے۔ اسے چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ دریائے کنہار مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر اس قصبے کے اندر سے گزرتا ہے اور کئی جگہ شاخ در شاخ تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہاں کچھ نئے آبی دھارے بھی دریا میں شامل ہوتے ہیں۔ اس پُرجوش پانی کی گونج ایک دلنواز موسیقی کی طرح پورے کاغان میں گونجتی ہے۔ کاغان میں اچھے ہوٹل ہیں، بازار بھی ہیں لیکن قصبے کا پھیلاؤ اتنا نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے۔ کاغان کی خوبصورتی اس بات کی متقاضی ہے کہ اس قصبے میں قیام وطعام کی بہترین اور وافر سہولتیں مہیا ہوں۔"

ہم نے بازار سے تھوڑا سا ہٹ کر "پلس پوائنٹ" نامی ایک ہوٹل میں قیام کیا۔

ہوٹل کی تعمیر میں زیادہ لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ دریا کی ایک شاخ ہوٹل کی چار دیواری کو چھو کر گزرتی تھی۔ کھڑکیوں میں بیٹھ کر اس پانی کا نظارہ کرنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ اتفاقاً ہمیں صرف دو کمرے مل سکے۔ ایک کمرے میں چھ بیڈ تھے، دوسرے کمرے میں سات تھے لیکن وہاں تین چار مزید بیڈ لگنے کی گنجائش تھی۔ یہ کافی کشادہ ہال نما کمرا تھا۔ سات آٹھ کھڑکیاں تھیں جو آبی گزرگاہ کی طرف کھلتی تھیں۔ پورا گروپ اس کمرے میں اکٹھا ہوگیا اور یہیں سونے کا فیصلہ کیا گیا۔ سب نے خوب انجوائے کیا۔ لنچ تو سفر کی نذر ہوگیا تھا لہٰذا ڈنر سرِشام ہی کرلیا گیا۔

جب بہت سے افراد ایک گروپ کی صورت میں کسی سفر پر نکلتے ہیں اور شب و روز اکٹھے رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو دریافت کرنے کا عمل غیر شعوری طور پر جاری رہتا ہے۔ عادات و خصائل، جذبات اور ترجیحات کے بارے میں نت نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ میں بھی غیر شعوری طور پر اپنے ہم سفر خواتین و حضرات کا مطالعہ کررہا تھا۔

اخلاق کی منگنی بڑے تایا کی جس بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی اس کا نام نرگس تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کو بے تحاشا پسند کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بولتی تھیں اور ان کی حرکات و سکنات علی الاعلان یہ گواہی دیتی تھیں کہ وہ ایک دوسرے میں گم

ہیں۔ عینی، نرگس کی چھوٹی بہن تھی اور کافی شوخ و شنگ بھی تھی۔ گروپ کے ہر فرد کے ساتھ اس کی چھیڑ چھاڑ ہمہ وقت جاری رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ زندگی کو انجوائے کرنے والی لڑکی ہے اور کافی حد تک آزاد خیال بھی ہے۔ اس کی شوخ مزاجی بلکہ رومان پسندی کا اندازہ مجھے رات کو ہوا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ایک بڑے ہال نما کمرے میں دس بارہ بستر دو قطاروں میں لگادیئے گئے تھے۔ ان بستروں پر ہم نے اپنی صاف ستھری چادریں بچھائی تھیں۔ ہوٹل کے لحاف ایک کونے میں ڈھیر کردیئے گئے تھے اور اوڑھنے کے لئے اپنے کمبل نکال لئے گئے تھے۔

ہم سب بے ترتیب سے لیٹے ہوئے تھے۔ میرے دائیں طرف خلاق تھا، بائیں طرف رضوان تھا۔ نرگس کے ساتھ عینی اور نرگس کا چھوٹا بھائی نومی تھا۔ نومی کے ساتھ عینی تھی۔ ہال نما بڑے کمرے کا ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ پورے کمرے میں صرف ایک بلب روشن تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے موم بتی جل رہی ہو۔ کھڑکیوں سے باہر پانی کا وجد طاری کرنے والا ردھم تھا۔ ہم بستروں پر لیٹے کافی دیر گپ شپ کرتے رہے پھر دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ میری آنکھ ایک عجیب سے احساس کے ساتھ کھلی تھی۔ یوں لگا جیسے بالوں میں کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ میرا ہاتھ سر کی طرف گیا اور کسی کی نرم و نازک انگلیوں سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی چوڑیوں کی مدہم کھنک کانوں میں گونجی۔ میرا ہاتھ جیسے ہزاروں وولٹ کے ننگے تاروں سے چھو گیا تھا، ایک لمحے میں میرے دل نے گواہی دی کہ یہ عینی کا ہاتھ ہے اور یہ ہاتھ دانستہ میرے سر تک پہنچا ہے۔ بے ہوشی کی نیند میں اکثر انسان ہاتھ پاؤں پھیلا کر سوتا ہے لیکن یہ ہاتھ بے ہوشی میں نہیں، ہوش میں مجھ تک پہنچا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے آہستگی سے کلائی تھام لی۔ ہاتھ بالکل بے حرکت ہوگیا۔ شفاف چوڑیوں کا لمس میری رگوں میں خون کی گردش کو انتہا تک پہنچا رہا تھا۔

میں عینی کی جرأت کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہورہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بولڈ اور تیز رفتار ثابت ہوگی۔ ہماری جان پہچان کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ بمشکل چار دن۔ مگر وہ ایک ایسا کام کررہی تھی جو ایک مشرقی لڑکی چار برسوں کی رفاقت کے بعد بھی کرتے ہوئے جھجکتی ہے۔ اس کی انگلیاں اب میرے بالوں پر بے حرکت دھری تھیں لیکن ان میں تڑپتی ہوئی بجلیوں کا ادراک مجھے تھا۔

عینی کا جو تصور میرے ذہن میں قائم ہوا تھا وہ ایک دم گہنا سا گیا۔ شرم و جھجک عورت کا لباس ہوتی ہے لیکن کمرے کی اس تاریکی میں عینی مجھے اس لباس سے بے نیاز نظر آئی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ پھر بھی اس نے اپنا ہاتھ کسی طور............ مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ اگر یہ فاصلہ نہ ہوتا تو پتا نہیں اس کی پیش قدمی کس انداز کی ہوتی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ میری طرف سے ایسی کون سی بات ہوئی ہے جس نے عینی کی اس قدر حوصلہ افزائی کی ہے۔ کتنی عجیب بات تھی' بڑے تایا اور چھوٹے تایا اپنے گھرانوں کو پوری برادری میں شرافت کا علم بردار سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ان کی اولادیں تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کی امین تھیں اور ان کی تعریف میں بولتے دونوں بزرگ حضرات کی زبانیں نہیں تھکتی تھیں لیکن آج میں اس شرافت اور حسنِ اخلاق کا کھوکھلا پن دیکھ رہا تھا۔

اچانک عینی کا ہاتھ میرے بالوں سے ہٹ گیا۔ ایک دو مدھم آہٹیں سنائی دیں پھر دوبارہ یہ ہاتھ میرے قریب آگیا۔ اب ہاتھ کی پشت میرے رخسار سے چھو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ "ہاتھ" اب زیادہ آسانی سے مجھ تک پہنچ رہا ہے۔ شاید عینی کوشش کر کے کچھ مزید آگے کھسک آئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے پُرجوش انداز میں انگلیوں میں انگلیاں پیوست کر دیں۔

نہ جانے وہ کب تک میرا ہاتھ تھامے رہتی' اچانک آہٹ سنائی دی اور کمرے کا بلب اچانک روشن ہوگیا۔ گو یہ مدھم روشنی تھی مگر گھپ اندھیرے میں بلب اچانک روشن ہوا تو یوں لگا جیسے دن چڑھ گیا ہے۔ عینی کا ہاتھ بڑی سرعت سے غائب ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی کھٹ پٹ سنائی دی۔ میں نے آنکھوں میں درز بنا کر دیکھا' عینی کی بھابی کمرے کے وسط میں کھڑی تھیں اور کھوجی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر ان کی نگاہیں عینی کے بستر پر جم کر رہ گئیں۔ میں نے ان کی گوری چٹی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹ صاف محسوس کی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عینی کا کمبل درست کیا اور اس سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں بولیں۔ "نومی کو پائنتی کی طرف کیوں ڈال دیا ہے؟ اپنے ساتھ لٹاؤ اسے۔"

عینی نے نیند سے بوجھل آواز بنا کر کہا۔ "مجھے نہیں پتا............ خود ہی ٹانگیں چلا کر

گھوم گیا ہے ادھر۔"

پھر میں نے دیکھا کہ عینی کی بھابی نومی کو اٹھا کر عینی کے پہلو میں لٹا رہی ہے اور ساتھ ساتھ خشمگیں نظروں سے عینی کو دیکھ رہی ہے۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آرہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے عینی کے ہاتھ کی رسائی آسانی سے مجھ تک کیسے ہوگئی تھی۔ یقیناً اس نے چھوٹے بھائی کو پہلو سے اٹھا کر پائنتی کی طرف لٹا دیا تھا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ عینی کی بھابی فرحین اس پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ غالباً وہ اس بات سے بھی آگاہ ہو چکی تھی کہ عینی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس صورتِ حال نے اسے حد سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ جانے سے پہلے فرحین نے کمرے کی لائٹ تو بجھا دی لیکن برآمدے کا بلب جلا دیا۔ کھڑکیوں سے چھن کر آنے والی روشنی نے کمرے کی گہری تاریکی کو نیم تاریکی میں بدل دیا۔ کھڑکیوں کے پار سے کمرے میں داخل ہونے والا پانی کا شور رات کے سناٹے میں کچھ اور بھی متاثر کن لگ رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد صبح تک مجھے نیند نہیں آسکی۔ شاید عینی بھی جاگ رہی تھی مگر بھابی کی صورت دیکھنے کے بعد اس نے اپنی بیداری کا کوئی عملی ثبوت فراہم نہیں کیا۔

علی الصباح میں نے دیکھا فرحین برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ جب کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تھی تو کمرے میں ایک نگاہ ضرور ڈال لیتی تھی۔ برآمدے میں ایک طرف مصلیٰ بھی بچھا ہوا تھا۔ شاید وہ تھوڑی دیر پہلے تک نماز پڑھتی رہی تھی۔

میں نے چور نظروں سے عینی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جاگ گئی تھی اور کمبل میں سے ایک آنکھ نکالے' میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی یہ ادا خوبصورت تھی۔ لحاف میں سے نکلی ہوئی اکلوتی آنکھ میں شوخی تھی۔ اس کے علاوہ رات والی رنگین مصروفیت کا خمار بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ شرمیلے انداز میں مسکرانے لگی۔

ناشتے پر سب جمع تھے۔ بڑا دلنواز ماحول تھا۔ رات کی پُرسکون نیند کے بعد ہر چہرہ کھلا کھلا اور تروتازہ نظر آرہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دریائے کنہار کا ایک دھاڑتا' شور مچاتا دھارا تھا۔ پس منظر میں برف کے چمکیلے تاج والی فلک بوس چوٹیاں تھیں............ اگر کوئی اس خوبصورت ماحول کا حصہ نظر نہیں آتا تھا تو وہ عینی کی بھابی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ

صرف گہری سنجیدگی تھی بلکہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رات بھر جاگتی رہی ہے اور جلتی کڑھتی بھی رہی ہے۔

ایک دوبار فرحین کی خشمگیں نظر مجھ پر پڑی اور میں نے فوراً نگاہ جھکالی۔ کچھ یہی کیفیت عینی کی بھی تھی۔ وہ فرحین سے نظر نہیں ملا رہی تھی اور نہ براہِ راست بات کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ بچوں کے علاوہ گھرانے کے نوجوان افراد پر بھی فرحین کا کافی رعب ہے اور وہ سب اس کی خفگی سے ڈرتے ہیں۔ اور تو اور اخلاق بھی فرحین سے محتاط لہجے میں ہی بات کرتا تھا۔

ہمیں کاغان سے روانہ ہونے کی کوئی جلدی نہیں تھی' لہٰذا گرماگرم ناشتے کے فوراً بعد سب لوگ دریا کی طرف نکل گئے۔ دریا کا پاٹ یہاں خاصا وسیع تھا۔ دیوہیکل چٹانیں پانی کا راستہ روکے کھڑی تھیں اور پانی ان چٹانوں سے لڑتا جھگڑتا چیختا چلاتا اپنے راستے پر گامزن تھا۔ لبِ دریا پہنچ کر سب کے سب مستی میں آگئے' اور تو اور چھوٹی تائی چھوٹے تایا جان بھی شلواریں چڑھا کر پانی میں اتر گئے اور اٹکھیلیاں کرنے لگے۔ اخلاق اور نرگس دھڑا دھڑ تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اخلاق کی زیادہ تر توجہ اپنی ہونے والی بیوی نرگس کی طرف تھی۔

عینی چیخ کر بولی۔ "اخلاق بھائی! آپ کو باجی نرگس کے علاوہ کچھ اور بھی دکھائی دیتا ہے۔"

وہ آہستہ سے بولا۔ "ہاں' اس کا ہرا سوٹ بھی نظر آتا ہے۔"

تنویر بولا۔ "ہاں.......... ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آئے گا۔"

عینی کھلکھلا کر ہنس دی اور اس نے نرگس پر پانی کے چھینٹے اڑائے۔ نرگس اسے مارنے کے لئے دوڑی۔ دونوں پانی میں دور تک بھاگتی گئیں۔ پھر عینی کا پاؤں پھسلا اور وہ سرد پانی میں گر کر شرابور ہوگئی۔ اخلاق نے کھٹا کھٹ اس کی دو تصویریں اتار لیں۔ وہ اٹھ کر بڑی ادا سے اپنے کرتے کا دامن نچوڑنے لگی۔ بھیگے ہوئے لباس نے اس کے ہیجان خیز نشیب و فراز کو نمایاں کردیا تھا۔ اوپر سے وہ کھڑی بھی خاص انداز سے تھی۔ اس نے سب کی نظر بچا کر میری طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ اس کا پاؤں واؤں نہیں پھسلا اور وہ جان بوجھ کر گری تھی۔ اس کی بانکی طبیعت کا کچھ کچھ اندازہ

مجھے ہونے لگا تھا۔

فرحین برا سامنہ بنا کر آگے بڑھی اور ایک موٹی شال عینی کے کندھوں پر ڈال دی۔ پھر اسے ڈانٹ کر بولی۔ "چلو باہر نکلو اب.......... بالکل بچی بن جاتی ہو۔"

عینی ٹھنکی۔ "نہیں آپی' تھوڑی دیر اور.........."

اس نے شال وہیں ایک پتھر پر رکھ دی اور پانی میں مزید آگے چلی گئی۔ فرحین کنارے پر کھڑی اپنے آپ میں کھولتی رہی۔ عینی کو شال تھمانے کے چکر میں وہ میرے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ "فرحین صاحبہ! اس میں عینی کا قصور نہیں۔ آپ دیکھیں' سب لوگ ہی اٹکھیلیاں کررہے ہیں۔ یہ جو اچھلتا ناچتا پانی ہے ناں' یہ بندے کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اس کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "بس کیوں نہیں چلتا.......... یہ دیکھو' یہ پتھر پڑے ہیں' یہ تو اٹکھیلیاں نہیں کررہے' ان میں وزن ہے۔"

میں نے کہا۔ "پتھر تو پتھر ہوتا ہے فرحین صاحبہ.......... باقی تبدیلی تو ان پتھروں میں بھی آتی ہے' جلدی نہ آئے' دیر سے آتی ہے اور اچھی نہ آئے تو بری آجاتی ہے۔ پانی اندر ہی اندر انہیں کاٹ کر رکھ دیتا ہے' سوراخ کردیتا ہے ان میں۔"

وہ خشک لہجے میں بولی۔ "اور جو پانی میں بہہ جاتے ہیں ان کا حشر کہیں زیادہ بُرا ہوتا ہے۔ ریت کے ذروں کی طرح حقیر ہوجاتے ہیں وہ.......... بہاؤ میں بہنا بہادری نہیں ہوتا' اس کا راستہ روکنا بہادری ہوتا ہے۔"

"کیا آپ لوگ سیدھی سیدھی گفتگو نہیں کرسکتے۔ ایسی مکالمہ بازی تو ڈراموں میں سنا کرتے ہیں۔" یہ میرے چچا زاد ندیم کی آواز تھی جو نہ جانے کب خاموشی سے ہمارے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔

ندیم قبول صورت نوجوان تھا۔ بچپن سے اس کی آواز بہت اچھی تھی' سینکڑوں ہندوستانی اور پاکستانی فلمی گانے اسے ازبر تھے اور وہ موقع محل کے لحاظ سے ان گانوں کے مکھڑے اپنی گفتگو میں استعمال کرتا رہتا تھا۔ اس موقع پر بھی اس کی رگ موسیقی پھڑکے بغیر نہ رہ سکی' بولا۔ "آپ کیا آپس میں باتیں کرنا شروع ہوگئے ہیں۔ بشیر احمد نے کیا خوبصورت گانا گایا تھا فلم درشن میں۔ یہ موسم' یہ مست نظارے' پیار کرو تو ان سے کرو'

کرتے ہیں یہ تم کو اشارے پیار کرو تو ان سے کرو۔"

فرحین نے گھور کر ندیم کو دیکھا تو وہ جو باقاعدہ ترنم سے سنانے کا ارادہ کر رہا تھا' ایکدم چپ ہوگیا۔

☆======☆======☆

دن کے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم کاغان سے ناران کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ ہمارے سفر کا کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ سڑک ناپید تھی۔ ایک تنگ سا پتھریلا راستہ تھا۔ سامنے سے کوئی گاڑی آتی تو بالکل کنارے پر لگ کر راستہ دینا پڑتا تھا اور کنارے پر لگنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے فولادی دل گردہ درکار تھا۔ کنارے سے سینکڑوں فٹ نیچے دھاڑتا پھنکارتا ہوا دریائے کنہار تھا۔ وہ کسی عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا اور اس کے تیور گواہی دیتے تھے کہ وہ اپنے جبڑے میں آنے والے کسی ذی روح کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

اس راستے پر ہمیں صرف جیپیں ہی نظر آرہی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی کار یا وین قسم کی سواری نظر آتی تھی تو اخلاق کی ڈھارس بندھتی تھی کہ اس راہِ پُر خطر پر "کار سواری" کا رسک لینے والے ہم پہلے مہم جو نہیں ہیں۔ جونہی کوئی کار نظر آتی تھی اخلاق کا خون سیروں بڑھ جاتا تھا۔ وہ انگلی اٹھا کر پکار اٹھتا تھا' وہ دیکھو' وہ ایک اور کار آرہی ہے۔ اگر وہ کار ناران کی طرف سے آتی تھی تو اخلاق کا مورال مزید بلند ہوجاتا تھا.........۔ "دیکھو بھائیو اور بہنو! اگر یہ کار بقائمی ہوش و حواس اپنے ٹائروں پر چل کر ناران سے واپس کاغان آسکتی ہے تو ہماری کاروں کو کون سے پوشیدہ امراض لاحق ہیں کہ وہ ناران نہیں جاسکتیں۔"

اخلاق کی حد سے بڑھتی ہوئی خوش فہمی کو دور کرنے کے لئے میں نے کہا۔ "بھائی! کاریں واپس آتو رہی ہیں لیکن ان سے یہ بھی تو پوچھو کہ ناران سے آرہی ہیں یا راستے ہی سے لوٹ رہی ہیں اور اگر ناران سے ہی آرہی ہیں تو ٹھنڈے پیٹوں آرہی ہیں یا آہیں بھرتی ہوئی آرہی ہیں۔"

"یار! تم بڑے قنوطی واقع ہوئے ہو۔ ہر معاملے کا تاریک پہلو ہی دیکھتے ہو" اخلاق نے کہا۔

"جسے تم تاریک پہلو کہہ رہے ہو یہ میری۔ "باخبری" ہے۔ جس راستے پر ہم جارہے ہیں اس پر ایک دو بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو ان مقامات کو گلیشیر کہتے ہیں۔ یہ گلیشیرز جیپوں کے سوا کسی قسم کی گاڑیوں سے دوستانہ تعلقات نہیں رکھتے۔ گاڑی کے پینڈے پر نیچے سے ایسی ضرب لگاتے ہیں کہ بس ناکارہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔"

"برف کی ضرب گاڑی کا کیا بگاڑ لے گی؟" سلجوق نے کہا۔

"ضرب برف کی نہیں ہوتی' ان چھوٹے بڑے پتھروں کی ہوتی ہے جو برف میں چھپے رہتے ہیں۔ جیپیں چونکہ اونچی ہوتی ہیں لہٰذا ان پتھروں سے بچی رہتی ہیں۔"

اپنی بات ثابت کرنے کے لئے مجھے جلد ہی ایک موقع مل گیا۔ سامنے سے ایک ہنڈا سوک کار آتی دکھائی دی۔ راستہ ایسا تھا کہ گاڑیوں کی رفتار دس میل فی گھنٹا سے ہرگز نہیں بڑھتی تھی' لہٰذا جب میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ہنڈا کار رک گئی۔ درمیانی عمر کے ایک نہایت تنومند صاحب ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھے۔ نہایت گھنی مونچھوں کے نیچے ان کے بھدے ہونٹ افق تا افق پھیلے ہوئے تھے۔ پہلو میں ایک نہایت خوبصورت دبلی پتلی سی لڑکی فروکش تھی۔ لڑکی کے سنگھار اور لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نوبیاہتا ہے۔ عقبی نشست پر ایک ملازمہ صورت عورت موجود تھی۔ میں نے گھنی مونچھوں والے سے پوچھا۔

"کیوں جناب' راستہ کیسا ہے؟"

"راستہ تو جیسا ہے' آپ کے سامنے ہے لیکن گلیشیر بہت تنگ کرتے ہیں۔" پاٹ دار آواز میں جواب ملا۔

"کتنے گلیشیر ہیں ناران تک؟"

"تین ہیں درمیان والا زیادہ لمبا ہے اور زیادہ خطرناک بھی ہے۔ میری گاڑی کو نیچے سے کافی رگڑے لگے ہیں۔ شاید کچھ ٹوٹ بھی گیا ہے' مسلسل آواز آرہی ہے۔ اب بالاکوٹ جا کر ہی دکھاؤں گا۔"

اخلاق اور تنویر وغیرہ کے منہ لٹک گئے۔ گھنی مونچھوں والے نے ہمیں گلیشیرز پر سے گاڑی گزارنے کے سلسلے میں کچھ مفید۔ "ٹپس" دیں اور آگے بڑھ گیا۔ اس کی گاڑی کے نچلے حصے سے واقعی کھٹ پٹ کی آواز آرہی تھی' سائیلنسر بھی کچھ پھٹا پھٹا سا تھا۔

میں نے کہا۔ "گاڑی کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو TIPS ہمیں دی گئی ہیں' ان پر ہمیں ہرگز عمل نہیں کرنا چاہئے۔ ورنہ ہماری گاڑیوں کا مستقبل تاریک تر ہوسکتا ہے۔"

اخلاق بولا۔ "بھئی ممکن ہے کہ یہ وہ ٹپس ہوں جن پر یہ صاحب بوجوہ عمل نہ کرسکے ہوں اور اب اپنے تجربے کا فائدہ ہمیں پہنچانا چاہتے ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہم ہر چیز کا تاریک پہلو ہی دیکھیں۔"

"لیکن ہرچیز کا صرف روشن پہلو بھی تو نہیں دیکھا جاسکتا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں کہ پہلو میں گرجتا برستا دریائے کنہار ہو۔" عقب سے تنویر نے کہا۔

"ہاں.......... تاریک اور روشن پہلو تو ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔" ندیم نے کہا "ابھی ہم نے اس کی جیتی جاگتی مثال بھی دیکھی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اخلاق نے پوچھا۔

"بھئی ہنڈا کار میں تم نے دیکھا نہیں تھا' تاریک پہلو کے پہلو میں روشن پہلو بھی تھا۔ ہائے کیا چیز تھی ظالم.......... مگر کس ظالم جن کے قبضے میں تھی۔ اگر میرے بدترین اندیشے درست ہیں تو وہ اس موٹے کی بیوی ہی تھی۔"

تنویر نے تائید کی۔ "لنگور در پہلوئے حور تو سنا تھا لیکن ریچھ در پہلوئے حور کبھی نہیں سنا تھا۔"

ندیم نے کہا۔ "یار' تمہیں محاوروں کی پڑی ہے' میرا دل نکلا جارہا ہے۔ کتنا ظلم ہوا ہے اس قسمت ماری کے ساتھ۔ پتا نہیں کیا مجبوریاں ہوں گی جن کا نتیجہ اتنے موٹے اور بھدے شوہر کی صورت میں نکلا ہے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی اور اتنا بیکراں شوہر۔ کیسے اندھے والدین تھے جنھوں نے لڑکی کو پال پوس کر روڈ رولر کے نیچے دھکا دے دیا۔"

ندیم کے چہرے پر بے پناہ اداسی چھارہی تھی اور لگتا تھا کہ نامعلوم لڑکی کی بدنصیبی دیکھ کر وہ اپنی زندگی سے بیزار ہوگیا ہے۔ وہ مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور تاسف کا اظہار کررہا تھا۔

ایک ذرا کشادہ موڑ پر ہم نے گاڑیاں روکیں۔ یہاں دریائے کنہار کے اوپر ایک شاندار پُل موجود تھا۔ ہوا میں معلق ایسے کئی پُل ہمیں دریا پر نظر آچکے تھے اور آئندہ بھی

آنے والے تھے لیکن اس پُل کا محل وقوع ایسا شاندار تھا کہ ہم رکے بغیر نہیں رہ سکے۔ گروپ کے ہر شخص نے سب سے پہلے میرا حال احوال پوچھا۔ سب فکر مند تھے کہ دشوار سفر کی وجہ سے میری طبیعت کہیں پھر نہ بگڑ جائے۔ ظاہر ہے میرے ہم سفروں کی فکر مندی کا میری ذات سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ یہ لوگ میرا حال نہیں پوچھ رہے تھے' اپنے تفریحی پروگرام کی خیر خیریت دریافت کررہے تھے۔ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ میرے گردے میں اٹھنے والی پہلی ٹیس کے ساتھ ہی ان کے تفریحی پروگرام کا مستقبل ڈانواں ڈول ہوجائے گا۔ میری خیریت پوچھنے کے ساتھ ساتھ وہ چوری چھپے اخلاق کو بھی کڑی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ حقیقت سبھی جانتے تھے کہ یہ سارا کیا دھرا اخلاق کا ہے۔ اگر وہ سارے ایک دونکے کے رشتے دار کو اتنی اہمیت دینے پر مجبور ہوئے تھے تو صرف اخلاق کی وجہ سے ہوئے تھے۔ صرف عینی تھی جس کی مزاج پرسی کا انداز ذرا مختلف تھا۔ اس کی نگاہوں میں لگاوٹ اور لہجے میں شیرینی اتنی زیادہ تھی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کل رات والے "واقعے" کے حوالے سے دیوار پر اشتہار لگانے کی کوشش کررہی ہے۔

ہم سب پُل پر چڑھ گئے تو وہ باقاعدہ کپکپانے لگا۔ پُل پر کھڑے ہوکر دریائے کنہار کے پانی پر نظر جمائے رکھیں تو ایک دم یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دریا ساکت اور پُل متحرک ہوگیا ہے۔ سب نے اس "بصری واہمے" کا تجربہ کیا۔ یوں لگا جیسے ہم پُل پر سوار ہوکر ناران کی طرف اڑے جارہے ہیں' ندیم تو باقاعدہ چلانے لگا تھا۔ "بھائیو! ہم ناران پہنچ جائیں گے۔ ہماری گاڑیاں کون لائے گا۔"

پُل پر کافی تصویریں بھی بنائی گئیں۔ عینی نے نرگس اور اخلاق کو کھینچ کھینچ کر ایک دوسرے کے قریب کھڑا کیا۔ پھر ان سے کہا کہ وہ چہرے پر Smile لائیں' جب وہ مسکراہٹ لے آئے تو وہ بولی۔ "بڑا اچھا پوز ہے' اگر میرے کیمرے میں ایک بھی تصویر بچی ہوتی تو میں آپ کی تصویر ضرور کھینچتی۔"

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ نرگس تیزی سے عینی کے پیچھے دوڑی۔ عینی قلانچیں بھرتی ہوئی گاڑی میں گھس گئی اور دروازے اندر سے لاک کرلئے۔

اس طرح ہنستے کھیلتے سفر جاری رہا۔ راستے میں ایک جگہ بورڈ لگا ہوا تھا۔ "ناران

دس کلومیٹر" میرا دل چاہا کہ واپس جاؤں اور اس بورڈ پر لکھ آؤں کہ "ناران دس حسین ترین کلومیٹر" یعنی یوں لگتا تھا کہ جنت کا ایک ٹکڑا زمین پر اتر آیا ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ ایک خواب ناک راستہ ہے جسے دنیا کے دلکش ترین مناظر نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے............ فلک بوس سرسبز پہاڑ' ہزاروں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبی دھارے' مستی میں جھومتا گاتا ہوا دریائے کنہار اور وہ پُرشکوہ چٹانیں جو عجیب وغریب زاویوں سے ایستادہ ہیں اور سینکڑوں ہزاروں برس سے اسی انداز میں اس خوبصورت ماحول کا حصہ ہیں۔

جلدی ہی ہمارا پالا پہلے گلیشیر سے پڑ گیا۔ پہاڑ کی ڈھلوان سے پھسل کر گلیشیر سڑک پر آ گیا تھا۔ کیونکہ گلیشیر تھوڑا تھوڑا کھسکتا رہتا ہے لہٰذا ہر دوسرے تیسرے روز مشینوں سے اسے کاٹا جاتا ہے تاکہ ٹریفک کے لئے راستہ صاف رہے۔ ہمارے گروپ میں سے بہت سے افراد نے گلیشیر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اسے چھونا چاہتے تھے۔ اس پر پیدل چلنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ہر نئی چیز کے لئے انسان کا تجسس اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ دیکھا دیکھی سب گاڑیوں سے اتر گئے۔ صرف چھوٹے تایا اور چھوٹی تائی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ فربہ اندام ہونے کے سبب وہ دونوں کچھ سست الوجود تھے۔ اخلاق نے کہا۔ "آنٹی' آپ نہیں اتریں گی؟"

"بھئی' کیا کرنا ہے اتر کر برف ہی تو ہے۔ دور سے بھی نظر آ رہی ہے۔"

ندیم نے کہا۔ "ہم تو یونہی احتیاطاً کہہ رہے تھے۔"

"احتیاطاً' کیا مطلب؟" چھوٹے تایا کے کان کھڑے ہوئے۔

"دراصل برف پر پہیے گھومتے ہیں اور کبھی کبھی گاڑی سلپ بھی کر جاتی ہے" ندیم نے عام سے انداز میں کہا۔

چھوٹی تائی کے چہرے پر چند لمحے کے لئے تذبذب کے آثار نظر آئے۔ پھر وہ اپنے گیند جیسے جسم کو لڑھکا کر گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ تایا نے بھی ان کی تقلید کی۔ بہرحال ہونی ہو کر رہتی ہے۔ یہ فربہ اندام جوڑا گاڑی میں بیٹھا رہتا تو یقیناً محفوظ رہتا پاپیادہ گلیشیر پار کرتے ہوئے یہ جوڑا دو بار لڑھکا اور دونوں بار انہیں بمشکل اٹھایا گیا۔ گلیشیر کی سطح سخت ناہموار تھی۔ گاڑیاں بے طرح اچھلتی ہوئی دوسرے کنارے پر پہنچیں۔

اس سے اگلا گلیشیر واقعی زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ سطح سخت ناہموار تھی۔ ایک دو جگہوں پر گہری کھائیاں بنی ہوئی تھیں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں سے گاڑی زخمی ہوئے بغیر گزر جائے گی۔ اس گلیشیر پر کچھ گاڑیاں پھنسی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں ایک کار تھی اور ٹویوٹا کے تین لوڈر تھے۔ کسی قریبی آبادی کے نوجوان لڑکے اور بچے وغیرہ ان گلیشیر زدگان کو مشکل سے نکالنے میں مدد دے رہے تھے۔ گاڑیوں کے پہیوں کے نیچے درخت کی چھال بچھائی جاتی تھی' دھکا لگایا جاتا تھا۔ ڈرائیور کو قیمتی مشورے دیئے جاتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شور مچایا جاتا تھا کہ گاڑیوں کے مالکان کو پتا چلتا رہے کہ ان کو برف سے نکالنے کے لئے کیسا "تابڑتوڑ تعاون" کیا جا رہا ہے۔

اس گلیشیر سے گزرنے کے بعد سب نے سکھ کا سانس لیا۔ گاڑیوں کے کیسٹ پلیئرز جو مسافروں کے سہم جانے کی وجہ سے بند ہو گئے تھے پھر سے آن ہو گئے۔ ہماری گاڑی میں بھی احمد رشدی کی جادو بھری آواز گونجنے لگی "ہاں' اسی موڑ پر اسی جگہ بیٹھ کر تم نے وعدہ کیا تھا' ساتھ دو گے زندگی بھر' چھوڑ کر تم نہ جاؤ گے۔"

ہر خوبصورت موڑ پر یقیناً کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی نے بیٹھ کر کوئی نہ کوئی حسین وعدہ کیا ہوتا ہے............ ہر چٹان' ہر چشمہ' ہر خوبصورت منظر کسی نہ کسی محبت کا گواہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ محبت کرنے والے ماضی کا حصہ ہوتے ہیں' وہ ہمیں نظر نہیں آتے' نہ ان کے وعدے سنائی دیتے ہیں' نہ ان کی آوازیں' لیکن وہ ان خوبصورت مناظر میں موجود رہتے ہیں۔ ان کی گم گشتہ محبتوں کا درد ان مناظر کو گداز بخشتا رہتا ہے' ان کی مکمل و نامکمل کہانیاں آس پاس کی رومانیت میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔

میں اپنے حسین پاکستان کو دیکھ رہا تھا اور اس کے حسن میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے گردوپیش کا کچھ ہوش نہیں رہا تھا مجھے............ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ کب تیسرا گلیشیر آ گیا ہے اور کب ہماری گاڑی سمیت تمام گاڑیاں رک گئی ہیں۔ مارگلہ ہماری کار کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس میں سلجوق کے علاوہ دیگر خواتین موجود تھیں۔ ان خواتین میں عینی کی خاموش طبع بھابی فرحین بھی موجود تھیں۔ میں نے چونک کر محسوس کیا' وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے گڑبڑا کر منہ پھیر لیا۔ چند سیکنڈ کے توقف سے میں نے دوبارہ ان کی طرف دیکھا۔ ان کی ٹکٹکی میری ہی طرف لگی ہوئی تھی۔ ان کی

نگاہ میں تپش تھی اور کسی حد تک غصے کا اظہار تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھیں اگر خاندان والے تم سے دور دور رہتے ہیں تو شاید ٹھیک ہی کرتے ہیں۔ تم ہو ہی اس لائق کہ تم سے فاصلہ رکھا جائے۔

ان لمحات میں' میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ اس بے نام تعلق سے آگاہ ہو گئی ہیں جو پچھلے پانچ چھ روز میں میرے اور عینی کے درمیان پیدا ہوا ہے......... یہ تیسرا گلیشیر جس کا میں ذکر کر رہا ہوں' ناران کے بالکل قریب واقع ہے۔ بلندی سے ناران کی خوبصورت وادی اور آبادی صاف دکھائی دیتی ہے۔ دریائے کنہار یہاں خاصا شریف النفس نظر آتا ہے' بقول ندیم' ناران میں دریائے کنہار کو دیکھ کر کسی ایسے فاسٹ باؤلر کا تصور ذہن میں آتا ہے جو اپنے طوفانی رن اَپ کے لئے اسٹارٹ لے رہا ہو۔

ہم درمیانی گلیشیر سے گزر چکے تھے لہٰذا اس گلیشیر کو عبور کرنا آسان ثابت ہوا۔ اس آخری رکاوٹ کو پار کرنے کے بعد ہماری منزل ہمارے سامنے تھی۔ ناران اب کافی پھیل چکا ہے۔ چند سال پیشتر تک یہاں قیام و طعام کی ان سہولتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا جو اب یہاں موجود ہیں۔ بہت سے اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ اور ہوٹل بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں۔ کثیرالمنزلہ عمارتیں عام نظر آنے لگی ہیں۔ مین بازار کافی طول کھینچ چکا ہے اور یہاں ضرورتِ زندگی کی قریباً ہر شے نظر آجاتی ہے۔ ہم پنڈی سے ڈھیروں انڈے لے کر چلے تھے۔ خیال تھا کہ وہاں بہت مہنگے ہوں گے لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور معاملہ صرف انڈوں کا ہی نہیں تھا کئی اشیائے خوردونوش کے حوالے سے ناران نے ہمیں مایوس کیا۔ خاص طور سے سلجوق کو اس حوالے سے پریشانی ہوئی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ناران میں ہر اس شے کے نرخ ساتویں آسمان سے چھو رہے ہوں جو وہ پنڈی سے اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ اب اس کی دلی کیفیت اس فلم بین جیسی تھی جس نے سخت بھاگ دوڑ کر کے فلم کی ایڈوانس بکنگ کروائی ہو اور جب وہ مقررہ دن فلم دیکھنے جائے تو ٹکٹ بافراط و بہ آسانی مل رہے ہوں۔

ناران پہنچ کر ہم نے گاڑیاں ایک جگہ روک دیں۔ میں' اخلاق اور سلجوق ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ یہ کافی کٹھن کام تھا جس میں ہم نے قریباً دو گھنٹے صرف کئے۔ آخر ایک اچھے ہوٹل میں چار کمرے ہمیں دستیاب ہوگئے۔ کرایہ تھوڑا سا زیادہ تھا لیکن

جگہ۔ ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ پارکنگ کے لئے بڑی کشادہ جگہ تھی۔ بازار بالکل قریب تھا۔ گرم پانی کی سہولت چوبیس گھنٹے موجود تھی۔ اس ہوٹل تک پہنچنے سے پہلے ہم نے جو ہوٹل دیکھا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ شاید وہی ہوٹل دیکھنے کے بعد ہمارے دل و دماغ کی یہ حالت ہوئی تھی کہ ہمیں یہ ہوٹل دنیا کا خوبصورت ترین ہوٹل لگ رہا تھا۔ وہ ہوٹل مین بازار سے تھوڑا سا ہٹ کر تھا۔ دنیا بھر کے برے ہوٹلوں کی خصوصیات ناران کے اس ایک ہوٹل میں جمع ہو گئی تھیں۔ تنگ و تاریک کمرے' ٹوٹے ہوئے فرش' بدبودار غسل خانے سیلن زدہ دیواریں۔ اخلاق کا خیال تھا کہ یہ ہوٹل ناران کے "ہوٹل اونرز" نے جان بوجھ کر تعمیر کروایا ہے۔ ان کی خواہش ہوگی کہ اس ہوٹل کو دیکھنے کے بعد سیاحوں کو ناران کا ہر ہوٹل جنت نظیر لگنے لگے۔

جب ہم چابیاں وغیرہ لے کر واپس آئے اور گروپ سمیت ہوٹل کی طرف چلے تو اخلاق کی رگ شرارت پھڑکی۔ اس نے مجھے اور سلجوق کو چپکے سے بتایا کہ گروپ کو سرپرائز دینا ہے' پہلے اسی ہوٹل پر جانا ہے جو ناران کے "ہوٹل اونرز" نے سازش کے تحت بنا رکھا ہے۔

اخلاق کی گاڑی ہوٹل کے سامنے رکی تو باقی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ "کہاں ہے ہوٹل؟ کدھر ہے ہوٹل؟" کئی آوازیں ابھریں۔

اخلاق نے بڑے اطمینان سے تنگ و تاریک زینوں کی طرف اشارہ کیا۔ سب کے ماتھے ٹھنکے۔ بہرطور اخلاق کے پیچھے پیچھے چلتے سب اوپر پہنچے۔ بدبو سے سب کے دماغ پھٹنے لگے۔ ہوٹل کی اندرونی حالت دیکھ کر خواتین کی چیخیں نکل گئیں اور تو اور گروپ کے سب سے کفایت شعار بلکہ کنجوس رکن بڑے تایا بھی جز بز نظر آنے لگے۔ کافی ہنگامہ ہوا۔ بہرحال جب تھوڑی دیر بعد ہم گروپ کو لے کر اصل ہوٹل پہنچے تو بڑے تایا کے سوا سب کی باچھیں کھل گئیں۔

ہوٹل میں اپنا کھانا پکانے کی اجازت نہیں تھی۔ بہرطور ہم نے ہوٹل منیجر سے خصوصی اجازت طلب کی۔ اس موقع پر ندیم کی چرب زبانی کام آئی اور ہم یہ اجازت لینے میں کامیاب ہوگئے۔ ہمارے کمرے گراؤنڈ فلور پر واقع تھے۔ کمروں کے سامنے بڑا شاندار برآمدہ تھا۔ برآمدے کے ایک گوشے میں خواتین نے اپنا باورچی خانہ قائم کرلیا۔

ناران میں بجلی نہیں ہے۔ سرِ شام ہی ہر شخص اپنی بجلی خود پیدا کرنے لگتا ہے۔ یعنی آپ اپنا جہاں پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی جنریٹرز آن ہو گئے۔ بازار، ہوٹل، گھر، برقی قمقموں سے جگمگا اٹھے۔ ہمارے ہوٹل میں بجلی کی سہولت شام سے رات بارہ بجے تک مہیا تھی۔ اس مقصد کے لئے ایک دیوہیکل جنریٹر ہوٹل کے عقب میں موجود تھا۔ جنریٹر چلنے سے ناران کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دھوئیں سے فضا بھی کچھ کثیف ہو جاتی ہے لیکن ناران اپنے چاہنے والوں کو حسن و دلربائی کے جو خزانے بخشتا ہے ان کے مقابلے میں یہ شور اور کثافت کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

سفر کی وجہ سے خواتین تھکی ماندی تھیں لہٰذا رات کا کھانا ہم نے ہوٹل سے ہی کھایا جو خاصا مہنگا ثابت ہوا۔ ایک مرغ کڑاہی تقریباً ساڑھے تین سو روپے میں پڑی۔ رات کو دس گیارہ بجے تک گپ شپ کرنے کے بعد سب لوگ سو گئے۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں آخری مرتبہ تقریباً تین چار سال پہلے ناران آیا تھا۔ اس ناران اور آج کے جگمگاتے ناران میں بہت فرق نظر آ رہا تھا۔ رات ٹھیک بارہ بجے ہوٹل کا دیوہیکل جنریٹر بند ہو گیا۔ گھپ تاریکی چھا گئی۔ ہوٹل سے باہر پہلے ہی تاریکی کا راج تھا۔ پوری آبادی میں شاید اب ایک جنریٹر بھی نہیں چل رہا تھا۔ اندھیرے کا ایک اپنا ہی فسوں ہوتا ہے۔ کچھ نظر نہ آتے ہوئے بھی کبھی کبھی سب کچھ نظر آتا ہے۔ میں یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے کمرے سے باہر آ گیا۔ شلوار قمیض کے علاوہ میرے جسم پر صرف ایک سوئٹر تھا۔ باہر ہوا بہت خنک تھی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ایک ہی نگاہ میں، میں نے لاکھوں کروڑوں ستارے دیکھے۔ یہ اجرام فلکی جیسے روشن تر ہو کر زمین پر اتر آئے تھے۔ لگتا تھا کہ میں ہوٹل کی چھت پر کھڑے ہو کر انہیں چھو سکتا ہوں۔ یہ ایک یادگار منظر تھا۔ میں نے سوچا لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی تو یہی آسمان ہوتا ہے مگر ستاروں کے یہ جھرمٹ اور کہکشاؤں کی یہ دنیا کہاں ہوتی ہے۔ وہیں برآمدے میں کھڑے کھڑے میں نے مشرق کی طرف بلند و بالا پہاڑوں کے ہیولے دیکھے اور یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ان پہاڑوں میں تقریباً بارہ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر یخ بستہ پانی سے بھرا ہوا وہ عظیم الشان طلسمی پیالہ موجود ہے جسے جھیل سیف الملوک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کے مشرقی گوشے میں چمکتی ہوئی ایک کہکشاں بلند و بالا جھیل کے پانیوں

سے چھو رہی ہے۔ یہ شاعرانہ تصور تھا لیکن اس وقت حقیقت کے بالکل قریب لگ رہا تھا۔

ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عینی میرے قریب کھڑی تھی۔ اس کے شانوں پر ایک موٹی گرم شال تھی۔ "آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ بولی۔

"اندھیرا دیکھ رہا ہوں.......... اور تم؟"

"میں یہ دیکھنے چلی آئی تھی کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ اگر معلوم ہوتا کہ اندھیرا دیکھ رہے ہیں تو اندھیرا تو کمرے میں بھی بہت تھا۔ بلکہ اتنا زیادہ تھا کہ میں اٹھ کر چلی آئی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

وہ میرے بالکل قریب آن کھڑی ہوئی۔ گہری تاریکی کے باوجود مجھے اس کے مدھم خدوخال نظر آنے لگے تھے۔ "بخار تو نہیں ہوا؟" اس نے پوچھا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کہا۔ "مجھے تو نہیں ہوا لیکن لگتا ہے تمہیں ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں.......... اور اگر ہو بھی تو فکر کی بات نہیں، میں خود ڈاکٹر ہوں۔"

"لیکن ضروری تو نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر اپنا علاج خود کر لے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ "اکثر مستند ڈاکٹروں کو بھی اپنے علاج کے لئے دوسرے ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔"

"بلکہ میں نے تو مستند ڈاکٹروں کو اپنے جیسے ایرے غیرے حکیموں اور نیم حکیموں سے بھی رجوع کرتے دیکھا ہے۔"

"لیکن میں ایسی نہیں ہوں۔" پھر ذرا توقف سے بولی۔ "لیکن آپ نے خود کو ایرے غیرے حکیموں سے کیوں ملایا ہے؟ آپ میں کون سی بات ایری غیری ہے؟"

"بھئی میں تو الف سے لے کر یے تک ایرا غیرا ہوں۔ پتا نہیں تمہیں کیا نظر آ گیا ہے مجھ میں.......... مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھے یہاں سے پٹوا کر نکلواؤ گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں.......... تمہارے والد محترم کا ہاتھ بہت بھاری ہے۔ ایک مرتبہ بچپن میں، میں تمہارے بھائی صاحب سلجوق کا کرکٹ بیٹ توڑنے کی پاداش میں ان کے تھپڑ.......... کھا

چکا ہوں۔"

"کیسی بات کر رہے ہیں آپ!" وہ بولی۔ "ہم آپس میں فرسٹ کزن ہیں اور میرے زیر علاج بھی ہیں آپ.......... میں آپ سے پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ آپ اس وقت اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہے۔"

"ایسی ویسی بات کی شروعات تو ہے۔" میں نے زیر لب کہا۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہ تمہاری دلیل میں بے تحاشا وزن ہے' تمہیں تو ڈاکٹر کے بجائے وکیل ہونا چاہئے تھا۔"

اچانک خواتین والے کمرے میں کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔ "جاؤ اب.......... کہیں وہ تمہاری نک چڑھی بھابی صاحبہ نہ جاگ گئی ہوں۔"

عینی بھی تفتیشی نظروں سے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں.......... میں نے کہا۔ "سوچتی کیا ہو' جاتی کیوں نہیں؟"

وہ بولی۔ "خطرے کی کوئی بات نہیں کوہ پیما صاحب! آپ خواہ مخواہ ہی ہانپ گئے ہیں۔ کمرے میں ایک ہی موم بتی تھی' وہ میں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔"

اس نے چادر کے اندر سے موم بتی نکال کر مجھے دکھائی۔ انداز میں شوخی تھی۔ چند لمحے خاموشی رہی' پھر میں نے کہا۔ "ماچس تو کمرے کے اندر ہی ہوگی۔ اگر تمہاری بھابی صاحبہ نے وہ جلا کر دیکھ لی تو؟"

وہ سر ہلا کر بولی "ہاں اس مرتبہ آپ کی دلیل میں بھی بے تحاشا وزن ہے۔" دو چار سیکنڈ سوچتی رہی پھر دبے قدموں کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تاہم کچھ دیر تک دروازے کے سامنے سن گن لینے کے بعد وہ واپس آ گئی۔

"کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے بھابی ہی تھیں' دوبارہ لیٹ گئی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تمہاری بھابی کیا چیز ہیں عینی! ہر وقت لئے دیئے رہتی ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ اس گروپ میں شامل ہی نہیں ہیں۔"

"ہاں' وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ ان کی زندگی میں تلخی بھی تو بہت ہے اور یہ

ساری تلخی کامران بھائی کی وجہ سے ہے۔ کامران بھائی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی کینیڈا چلے گئے تھے۔ وہ ایک کورس کے سلسلے میں گئے تھے' ان کا ارادہ ایک سال میں واپس آ جانے کا تھا وہاں جا کر وہ کچھ ایسے مگن ہوئے کہ پاکستان کا راستہ بھول گئے۔ شروع میں ان کے خط آتے تھے پھر خط آنا بھی بند ہو گئے۔ اس کے بعد پتا چلا کہ وہ کینیڈا سے امریکا چلے گئے ہیں۔ قریباً دو سال بعد وہ واپس کینیڈا آ گئے۔ مگر اس مرتبہ وہ اکیلے نہیں تھے' ان کے ساتھ امریکن بیوی بھی تھی۔ ابو اور امی' ان کو سمجھانے کے لئے کینیڈا گئے۔ بڑی مشکلوں سے ان تک پہنچے۔ ابو قسم کھا کر گئے تھے کہ کامران کو پاکستان واپس لائیں گے اور اگر وہ نہ آیا تو اس سے قطع تعلق کر لیں گے۔ کامران بھائی نہیں آئے اور ابو ناراض ہو کر واپس آ گئے۔ اس واقعے کو اب قریباً پانچ برس گزر چکے ہیں۔ کامران بھائی سے ہمارا رابطہ بالکل منقطع ہے۔ خبر نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ کینیڈا میں ہیں یا امریکا میں۔ ان کا آخری خط ڈیڑھ دو سال پہلے آیا تھا۔"

"تمہاری بھابی تمہارے ساتھ ہی رہتی ہیں؟"

"ہاں' وہ بڑی صابر شاکر خاتون ہیں۔ شاید آپ کو یہ سن حیرانی ہو کہ جب سے ان کی شادی ہوئی ہے۔ وہ بہت کم میکے گئی ہیں۔ حالانکہ میکا بھی لاہور میں ہی ہے۔ شادی کے بعد وہ چند بار دو تین دن کے لئے اپنی امی کے پاس گئی ہوں گی۔ اب وہ جاتی ہی نہیں۔ اگر جاتی ہیں تو شام سے پہلے گھر لوٹ آتی ہیں۔ ابو امی سے انہیں اتنا پیار ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ خاص طور سے ابو کا تو کوئی کام کسی کو نہیں کرنے دیتیں۔ ابو آج کل کامران بھائی کی طرف سے بہت مایوس رہتے ہیں۔ وہ دلی طور پر چاہتے ہیں کہ فرحین بھابی کامران بھائی سے طلاق لے لیں اور کہیں شادی کر لیں۔ انہیں یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ بھابی یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کاٹیں گی۔ کوئی بچہ ہوتا تو بھی انہیں سہارا ہوتا۔ ویسے بھابی ٹھیک ٹھاک پڑھی ہوئی بھی ہیں۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ انہوں نے باقاعدہ تھی سس لکھا ہوا ہے۔ اے آئی (آرٹیفیشل انٹیلی جنس) میں ان کے پاس پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے۔"

واقعی چونکا دینے والی اطلاع تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے پوچھا۔

"کبھی طلاق کے بارے میں بات بھی ہوئی ہے۔"

"ہاں.......... اپنے آخری خط میں ابو نے کامران بھائی کو لکھا تھا کہ وہ فرحین بھابی کو طلاق دے دیں۔ کیونکہ انہوں نے کینیڈا میں اپنی نئی زندگی شروع کرلی ہے اور مستقبل میں ان کا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں.......... اپنے جوابی خط میں کامران بھائی نے طلاق دینے پر آمادگی ظاہر کردی تھی لیکن جب بھابی فرحین کو اس خط وکتابت کا پتا چلا تو انہوں نے رو رو کر برا حال کرلیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ہرگز طلاق نہیں لیں گی اور اگر اس سلسلے میں ان سے زبردستی کی گئی تو وہ کچھ کر گزریں گی۔"

"کیا انہیں اب بھی امید ہے کہ کامران پاکستان واپس آئے گا۔"

"معلوم نہیں.......... بہرحال وہ اب آہستہ آہستہ حالات کی عادی ہوگئی ہیں۔ کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اپنی محرومیوں سے سمجھوتا کرلیا ہے۔"

ہم کچھ دیر اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر ایک کمرے سے بڑے تایا جان کے کھانسنے کی مسلسل آواز آنے لگی۔ عینی بولی۔ "اب کچھ بھی ہوجائے بھابی' ابو جان کو کھانسی کی دوا پلانے کے لئے ضرور اٹھیں گی' لہٰذا میں چلتی ہوں۔"

اس نے میرا ہاتھ پُرجوش انداز میں دبایا۔ حوصلہ افزا نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن اسی دوران میں کمرے سے کھٹ پٹ کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ مجھ سے میرے حوصلے کا کوئی ثبوت مانگے بغیر جلدی سے واپس چلی گئی۔

☆======☆======☆

صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ سورج طلوع ہوچکا تھا۔ کمرے میں سب خراٹے لے رہے تھے۔ یقیناً دوسرے کمرے میں بھی گروپ کے ارکان خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ میں عینی کی بھابی کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ زرد پھولوں والی سفید قمیض اور سفید شلوار' قمیض پر زرد دھاریوں والی جرسی تھی۔ شانوں پر پڑی ہوئی کامدار شال نے خوبصورتی اور وقار میں اضافہ کردیا تھا۔ میں نے پہلی بار غور اور باریک بینی سے اس خاتون کو دیکھا۔ عمر چوبیس اور اٹھائیس سال کے درمیان ہی ہوگی۔ نقوش تیکھے اور چہرے پر خاص قسم کا حزن وملال تھا لیکن یہ کیفیت شخصیت کی مجموعی دلکشی میں کمی کے بجائے اضافہ کرتی تھی۔ ان کا تعلق میرے ددھیالی رشتے داروں سے ہی تھا۔ وہ میرے دادا کے بھائی کی پوتی تھیں۔ اپنے

والد کی طرح ان کا رنگ بھی غیر معمولی طور پر سرخ و سپید تھا۔ وہ بہت سے مقامی بچوں کے درمیان کھڑی تھیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں شاپر تھا' وہ شاپر میں سے سیب اور کیلے وغیرہ نکال کر بچوں میں تقسیم کررہی تھیں۔ بچے اس مہربانی پر بڑے خوش تھے اور جھپٹ جھپٹ کر اپنا حصہ وصول کررہے تھے۔ پھل ختم ہوگئے لیکن بچوں کے تقاضے ختم نہیں ہوئے۔ عینی کی بھابی اندر گئیں اور دو بڑی ڈبل روٹیاں اٹھالائیں۔ ساتھ میں جام کی شیشی تھی۔ وہ جام لگالگا کر ڈبل روٹی کے سلائس بچوں میں تقسیم کرنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈبل روٹی اور جام بھی ختم ہوگئے۔ اب کچھ اور بچے آگئے تھے اور فرحین کے گرد پھیلے ہوئے ہاتھوں کا حصار برقرار تھا۔ میں یہ صورتِ حال دیکھ کر باہر نکل آیا۔

فرحین کے چہرے پر بے بسی نظر آرہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیں۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں بچوں کے حصار سے نکالا۔ بچے ان سے چمٹے جارہے تھے۔ میں نے زیادہ بے باک بچوں کو ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور وہ تتر بتر ہوگئے۔ فرحین ہانپ سی گئی تھیں۔ شال شانوں سے ڈھلک گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آپ پہلی بار اس علاقے میں آئی ہیں۔"

"یہ بات آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟" فرحین نے پوچھا۔

"آپ کو مصیبت میں دیکھ کر کہنا پڑی یہ بات.......... یہاں غربت بہت ہے۔ آپ اس طرح دریا دلی کا مظاہرہ کریں گی تو درجنوں بچے یہاں جمع ہوجائیں گے اور مستقل طور پر جمع رہیں گے۔ ہمارا گھروں سے باہر نکلنا دوبھر کردیں گے۔"

بچے دور کھڑے تھے اور ابھی تک للچائی ہوئی نظروں سے فرحین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرحین کے چہرے پر تاسف ابھر آیا' بات تھی بھی تاسف کی۔ یہ علاقے جو قدرتی حسن سے مالا مال ہیں۔ معاشی طور پر بری طرح بدحال ہیں اور لاچاری کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اب تو پھر بھی صورتِ حال قدرے بہتر ہوئی ہے چند برس پہلے حالات اور بھی ترس ناک تھے۔ مجھے ۹۰ء کا ایک واقعہ آج تک یاد ہے۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ناران آیا تھا۔ ہم ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے' میرے ایک دوست نے چکن پیس کھا کر ہڈی باہر پھینکی' ہڈی کے ساتھ تھوڑا بہت گوشت لگا رہ گیا ہوگا۔ جونہی ہڈی کمرے سے باہر گری' گھات میں بیٹھے ہوئے چند بچے اس پر جھپٹے

اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوگئے۔ میں یہ منظر دیکھ کر اپنی بنیادوں تک ہل گیا‘ یہ کسی فلم یا ڈرامے کا منظر نہیں تھا۔ ہماری آنکھوں کے عین سامنے اشرف المخلوقات گوشت کے چند ریشوں کے لئے جانوروں کی طرح آپس میں لڑ رہا تھا۔ وہ معصوم بچے ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے اور بالکل چوپایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

آج فرحین کے گرد ترسے ہوئے چہروں کا جمگھٹا دیکھ کر وہ دردناک منظر پھر سے میری نگاہوں میں تازہ ہوگیا تھا۔ ”ایسا کیوں ہے؟“ فرحین بولی۔ ”کیا یہ پاکستان نہیں ہے۔ کیا یہ بچے ہمارے قومی جسم کا حصہ نہیں ہیں؟“

”بالکل ایسا ہے لیکن ہماری سہل پسندی کی وجہ سے ان کی حالت سنورتی نہیں۔“

”ہماری سہل پسندی؟“ فرحین کے لہجے میں تعجب تھا۔

”ہاں‘ ہماری سہل پسندی۔ ہم لوگ ان علاقوں میں آتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی حالتِ زار دیکھتے ہیں۔ ہمارے ضمیر میں کسک جاگتی ہے‘ مگر ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے ہم چند سکے ان لوگوں کی طرف اچھال دیتے ہیں اور مناظر کی دلکشیوں میں کھو جاتے ہیں۔ ہم کبھی ان کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچتے‘ ہم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا شمار اربابِ اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ کن فیکون کی طاقت رکھتے ہیں لیکن وہ بھی سہل پسندی سے کام لیتے ہیں۔ اس علاقے کی پھیلی ہوئی جھولی میں سطحی نوازشات کی خیرات ڈال کر ”سبحان اللہ“ کا ورد کرتے واپس چلے جاتے ہیں۔ کوئی یہاں سڑک نہیں پہنچاتا‘ بجلی نہیں پہنچاتا‘ دیگر شہری سہولتیں تو خیر دور کی بات ہے۔“

فرحین بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھیں‘ کہنے لگیں۔ ”آپ باتیں تو مدبروں جیسی کرتے ہیں لیکن..........“

”لیکن کیا..........؟“

ایک دم ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ وہی سنجیدگی جو انہیں ایک نہایت سنجیدہ اور باوقار روپ دیتی تھی اور جس کے سبب سب بڑے چھوٹے ان کا احترام کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”تیمور صاحب‘ بڑے خلوص سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

”جی فرمائیے۔“

”آپ نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ بد سے بدنام برا ہوتا ہے۔ آپ کو خیر بدنام تو کسی طور نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ خاندان کے کچھ لوگوں کی رائے آپ کے بارے میں زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اور جب رائے پہلے سے اچھی نہ ہو تو چھوٹی سی بات کا بھی بتنگڑ بن جاتا ہے۔ آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”آپ کو یہ تنبیہہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”اس بات کو آپ رہنے دیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولیں اور میری سگریٹ کو ناگواری سے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

میں جان گیا تھا کہ فرحین صاحبہ کا اشارہ کس طرف ہے۔ کاغان میں گزرنے والی رات نے میرے اور عینی کے حوالے سے ان کے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا۔

سارا دن دھوپ سینکتے اور اٹکھیلیاں کرتے ہوئے گزرا۔ سہ پہر کو گلیشیر پر جانے کا پروگرام بنا۔ یہ وہی تیسرا اور آخری گلیشیر تھا جسے عبور کرکے ہم وادی ناران میں داخل ہوئے تھے۔ آبادی سے گلیشیر کا فاصلہ بمشکل ایک کلومیٹر ہوگا۔ سفر کے دوران میں ہماری گاڑیوں کا بھی سوا ستیاناس ہوچکا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ گاڑیوں کو دھلوا لیا جائے۔ یہ کام بھی وہیں گلیشیر کے پاس ہوسکتا تھا۔ جس جگہ گلیشیر دریائے کنہار میں گرتا تھا وہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ دریا کے ساتھ چند چھوٹے بڑے دھارے بھی بن گئے تھے۔ ان دھاروں کے درمیان خشکی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے اور یہاں کیمپ وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ یہ کیمپس سیاح حضرات اپنے ساتھ لے کر آئے ہوئے تھے۔ گنگناتے‘ کھلکھلاتے ہوئے دریا کے کنارے آرام دہ خیموں میں رات گزارنا ان سیاح حضرات کے لئے یقیناً ایک خوش گوار تجربہ ہوتا ہوگا۔ اس جگہ کرائے پر بھی خیمے دستیاب تھے۔ کئی شوقین خواتین وحضرات نے کسی ہوٹل میں رہنے کے بجائے ان خیموں میں رہنے کو ترجیح دے رکھی تھی۔ یہاں دریا کے کنارے پر ایک چائے خانہ بھی موجود تھا۔ چائے نوش فرمانے کے لئے دریا کے عین کنارے پر لکڑی کے اسٹول اور میزیں رکھی تھیں۔ بڑا دلکش ماحول تھا۔

گاڑیاں دھونے کے لئے مقامی لڑکوں کے حوالے کردی گئیں۔ پورا گروپ مختلف ٹولیوں میں بٹ گیا اور یہ ٹولیاں اِدھر اُدھر گھومنے لگیں۔ گلیشیر پر پہنچنے اور وہاں اودھم

مچانے کا ہر کسی کو شوق تھا۔ کھیتوں کے درمیان سے گزر کر گرتے پڑتے ہم گلیشیر پر پہنچے۔ برف سخت اور میلی تھی' اس پر چلا تو جاسکتا تھا لیکن اودھم نہیں مچایا جاسکتا تھا۔ پھر بھی حسبِ توفیق سب نے ایک دوسرے پر برف کے گولے وغیرہ پھینکے۔ ندیم نے فلم آگ کا وہ مشہور گانا گایا۔ موسم حسین ہے لیکن تم سا حسین نہیں ہے' میری نظر سے پوچھو تم سا کہیں نہیں ہے۔ اگر وہ صرف گانے تک محدود رہتا تو بھی ٹھیک تھا لیکن جب اس نے محمد علی کی طرح باقاعدہ برف پر لڑھکنے اور پھسلنے کی کوشش کی تو برف میں چھپے ہوئے پتھر نے اس کی پشت پر کاری ضرب لگائی اور وہ کافی دیر گم صم رہا۔

تنویر ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ وہ ندیم کو اشاروں سے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ ندیم نے ایک ہاتھ کمر پر رکھا اور لڑکھڑاتا ہوا اس کے پاس چلا گیا۔

عینی مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "کچھ اندازہ لگایا آپ نے' وہ کدھر گئے ہیں؟"

"نہیں.......... تم بتاؤ.......... تمہارا کیا اندازہ ہے؟"

"اندازہ نہیں.......... مجھے ٹھیک ٹھیک پتا ہے کہ چٹان کے پیچھے کیا ہوگا۔ ادھر اس لفنگے تنویر نے برف کا مجسمہ بنا رکھا ہوگا۔ دونوں اس مجسمے پر غیر شریفانہ تبصرے کریں گے اور شیطانی ہنسی ہنسیں گے۔ ہمیں معلوم ہے' ان لڑکوں کے یہی کام ہوتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کسی عورت کا مجسمہ ہوگا؟"

"عورت کا نہیں لڑکی کا' ایک دم خطرناک مجسمہ!" وہ منہ پھیر کر شرم آمیز شوخی سے مسکرائی۔

اخلاق اپنے کام سے لگا ہوا تھا۔ وہ دھڑا دھڑ اپنی ہونے والی بیوی کی تصویریں کھینچ رہا تھا اور جب وہ خود نہیں کھینچتا تھا تو کسی دوسرے سے کھنچواتا تھا۔ گلیشیر پر واپسی کا سفر خطرناک تھا۔ ڈھلوان کی وجہ سے بار بار پاؤں پھسل جاتا تھا۔ عینی نے میرے ہاتھ کا بلکہ پورے بازو کا سہارا لیا۔ وہ میرے بازو پر لد سی گئی تھی۔ اس کے بال ہوا سے منتشر ہو کر میرے چہرے پر پھیل رہے تھے۔ بڑے تایا اور تائی جان تو ہوٹل میں ہی رہ گئے تھے لیکن عینی کا بھائی رضوان تو ساتھ تھا۔ مگر وہ رضوان کی کوئی خاص پروا نہیں کر رہی تھی۔ اگر اسے تھوڑی بہت پروا.......... تھی تو صرف بھابی صاحبہ کی تھی۔ اور بھابی کی یہ اہمیت صرف عینی تک ہی محدود نہیں تھی' پورے گروپ کے نوجوانان جو بھی شوخی شرارت

کرتے تھے' بھابی کی نظر بچا کر کرتے تھے۔ اب جبکہ ہم گلیشیر سے اتر رہے تھے' تو بھی بھابی کا تذکرہ ہی ہو رہا تھا۔ بھابی نیچے دریا کے کنارے گاڑیوں کے پاس موجود تھیں لیکن ان کی نگراں نظروں کی تپش یہاں تک محسوس کی جا رہی تھی۔ بھابی دیکھ رہی ہیں۔ بھابی ناراض ہوں گی' بھابی سے شکایت کرنا ہوگی۔ اس قسم کے فقرے بار بار کانوں میں پڑ رہے تھے۔ ایک دو بار تو نرگس نے عینی اور فوزیہ کی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر "بھابی" کو باقاعدہ آوازیں بھی دے ڈالی تھیں۔

میں نے دور نیچے عینی کی "بھابی صاحبہ" پر نگاہ ڈالی۔ گاڑیوں کی "سروس" ہو رہی تھی اور وہ ان کے قریب کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ ان کے لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ بار بار انہیں سمیٹ کر شال کے نیچے چھپاتی تھیں۔ غروب ہوتے سورج کی کرنوں میں ان کی قمیض کے زرد پھول دمک رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ یہ پھول کسی کے لباس کا حصہ نہیں' بلکہ دریا کی لہروں نے اچھال کر کنارے پر پھینک دیئے ہیں۔

میں نے کہا۔ "عینی! مجھے لگتا ہے کہ فرحین صاحبہ ہماری ہی طرف دیکھ رہی ہیں۔"

"لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔"

"تو پھر چھوڑ دو بازو!"

"یہ بھی تو مشکل ہے۔" اس نے ٹھوڑی میرے کندھے سے لگا دی۔

"ارے ٹھوڑی ہٹاؤ۔" میں نے کہا۔

"اتنی دور سے بھابی کو ٹھوڑی' ٹھوڑی نظر آئے گی۔"

"نظر نہ آنے سے ہی تو شکوک بڑھتے ہیں اور تمہیں تو پتا ہے کہ میں پہلے ہی بہت مشکوک ہوں۔"

"کسی کی نظر میں آپ کچھ بھی ہوں۔ میری نظر میں وہی ہیں جو میں سمجھتی ہوں۔"

"اور تم کیا سمجھتی ہو؟"

"ایک سچا کھرا انسان۔ مہم جو' بلند حوصلہ' حسین فطرت کا عاشق' اوپر سے سخت اندر سے بہت نرم اور میٹھا۔ ایک ایسا شخص جس سے دیرپا دوستی کی جاسکتی ہے۔"

"دوستی بہت وسیع لفظ ہے' اپنے اندر بہت کچھ چھپا لیتا ہے۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے۔" عینی نے کہا۔ "ایک مرتبہ میں نے عمرانیات کے متعلق ایک

کتاب پڑھی تھی۔"

وہ مجھے کتاب کے بارے میں بتانے لگی۔ میں بظاہر عینی کی باتیں سن رہا تھا لیکن میری تمام تر توجہ دور نیچے ان زرد پھولوں کی طرف تھی جو دریا کی لہروں نے اچھال کر چمکیلی ریت پر پھینک دیئے تھے۔ ان پھولوں کے درمیان ایک پھول نیم گلابی بھی تھا' یہ شاید کسی کا چہرہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فرحین صاحبہ ہماری ہی طرف دیکھ رہی ہیں۔ نہ جانے اچانک میرے دل میں کیا آئی کہ برفیلی ڈھلوان پر اترتے اترتے میں جان بوجھ کر پھسلا' عینی بھی میرے ساتھ ہی پھسل گئی۔ ہم ایک دوسرے کے اوپر گرے اور اسکیٹنگ کے انداز میں بیس پچیس فٹ نیچے چلے گئے۔ عینی کے ہونٹوں سے ایک سریلی چیخ نکلی تھی اور وہ میرے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

جونہی ہم رکے' میں نے عینی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ پھسل کر اس نے انجوائے کیا تھا۔ بہرحال اس کے ذہن میں یہ شک نہیں گزرا تھا کہ یہ پھسلن "غیر اتفاقیہ" تھی۔

ہم نیچے پہنچے تو فرحین حسبِ توقع مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یقیناً انہوں نے گلیشیر پر میرے اور عینی کے لڑھکنے کا منظر دیکھا تھا۔ انہوں نے بڑے تحکمانہ لہجے میں عینی کو اپنی طرف بلایا اور اس سے کھسر پھسر کرنے لگیں۔ یقیناً عینی پر پندونصائح کی بارش ہو رہی تھی اور اسے سمجھایا جا رہا تھا کہ وہ میرے خطرناک سائے سے بھی دور رہے۔

رات دو کمروں میں لوڈو کی ہنگامہ خیز بازیاں جمی ہوئی تھیں۔ بہت شور غل ہو رہا تھا۔ عینی اصرار کر رہی تھی کہ میں بھی اس تماشے میں شرکت کروں لیکن میں اسے مسلسل ٹالتا رہا۔ میں نے کہا۔ "تمہاری بھابی صاحبہ نے پنجے نکال لئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی وقت حلق سے غراہٹ بلند کریں گی اور مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ مجھے تو لہولہان کریں گی ہی' تمہارے بھی سارے پر جھاڑ دیں گی۔"

میں عینی کو بھابی کا ڈراوا دے رہا تھا' اصل میں میرا دل خود ہی جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی دل و دماغ کی.......... میری آنکھوں کے سامنے بار بار وہ زرد پھول بکھر جاتے تھے جو میں نے دریائے کنہار کے کنارے دیکھے تھے۔ ان میں ایک پھول

نیم گلابی تھا اور وہ کسی کا چہرہ تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اطمینان سے لیٹوں اور بس لیٹا رہوں۔ کمرے میں میرے علاوہ اخلاق اور چھوٹے تایا جان بھی موجود تھے' اخلاق تو سو رہا تھا۔ چھوٹے تایا میگزین دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ جگالی بھی کرتے جا رہے تھے۔ غالباً پستہ وغیرہ کھا رہے تھے۔ میں نے کمبل سر تک اوڑھا اور آنکھیں موند لیں۔ زرد پھول آنکھوں کے سامنے بکھر گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اندر مسز فرحین کے لئے ایک خاص قسم کی دلچسپی پروان چڑھ رہی ہے۔ میں پچھلے کئی دن سے غیرارادی طور پر ان کے متعلق سوچ رہا تھا' کوئی ایسی بات تھی ان کی شخصیت میں جو مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ خاندان والوں کی آراء سے قطع نظر یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی کہ میں ڈھیلے ڈھالے کردار کا مالک نہیں تھا اور مجھ پر "دل پھینک" یا "عاشق مزاج" ہونے کا الزام تو میرے بدترین مخالف بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ کالج کے زمانے میں میرے ایک دو معاشقے ضرور ہوئے تھے لیکن وہ کبھی اخلاق کے دائرے سے نہیں نکلے اور نہ کبھی ان میں ایسی شدت آئی جس سے بدنامی کا سامان ہوتا.......... تاہم ناران کی وادی میں اترتے ہی میرے مزاج اور میری سوچوں میں ایک انقلابی تبدیلی آئی تھی۔ خبر نہیں یہ یہاں کے جادو بھرے ماحول کا اثر تھا' یا پھر ان زرد پھولوں کا جن میں انتہا درجے کی یاسیت اور دلکشی اس طرح گھل مل گئی تھی کہ ایک کو دوسری سے جدا کرنا مشکل تھا۔

☆======☆======☆

اگلا دن سب نے ناران کے اندر ہی گھومتے پھرتے گزارہ۔ اور تو اور میں بھی گروپ کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ شاید گروپ کے ارکان نے یہ سوچا تھا کہ ایک فرد کی وجہ سے تفریح برباد کیوں کی جائے۔ میرے لئے جو نفرت ان کے دلوں میں موجود تھی اسے تو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بڑے تایا اور تائی "داماد" کی مجبوری کے سبب میرے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ بڑوں نے میرے لئے گنجائش پیدا کرلی تھی تو چھوٹے بھی رعایت دینے پر آمادہ ہوگئے تھے.......... اگر کوئی رعایت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا تو وہ فرحین تھیں۔ وہ مجھ سے بہت لیے دیئے رہتی تھیں۔ ان کی تیز نظر ہمہ وقت میرا تعاقب کرتی تھی' خاص طور سے اس وقت جب عینی میرے آس پاس موجود ہوتی تھی۔

میرے ہاتھ بھی ایک مشغلہ آگیا تھا۔ مجھے جونہی فرحین کی صورت نظر آتی‘ میں عینی کی طرف متوجہ ہوجاتا یا اس کے قریب چلا جاتا۔ وہ اس صورتِ حال پر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں اور کسی وقت تو مجھے یوں لگتا تھا کہ ان کی قوتِ برداشت جواب دے جائے گی اور وہ دوسروں کی موجودگی کی پروا کئے بغیر مجھ پر پھٹ پڑیں گی یا پھر بڑے تایا جان کو میرے بارے میں کوئی ایسی رپورٹ دیں گی کہ وہ "داماد صاحب" کی ناراضگی کی پروا کئے بغیر مجھے دھکے دے کر ہوٹل سے رخصت کردیں گے۔ بہرحال ابھی تک ایسی نوبت نہیں آئی تھی اور مسز فرحین کی برداشت (جو واقعی قابلِ ذکر تھی) ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

فرحین کے طور اطوار سے خدا ترسی اور نیک دلی بہت نمایاں تھی۔ جہاں کہیں کسی فقیر یا محتاج کو دیکھتیں فوراً بٹوا کھول کر کھڑی ہوجاتیں۔ گروپ میں کسی کو کوئی تکلیف ہوتی‘ کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ اسے اپنا دردِ سر بنالیتیں۔ ہر کسی کی ضرورت کا خیال رکھنا اور آتے جاتے چھوٹے موٹے مسئلے نمٹاتے رہنا ان کی عادتِ ثانیہ تھی۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو ہر قسم کے لوگوں کو اپنی عزت کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

دوسرے روز جھیل سیف الملوک جانے کا پروگرام بنا۔ ہم نے رات ہی جیپ والوں سے بات کرلی تھی۔ ہوٹل کے قریب ہی ایک کھلا میدان تھا۔ وہاں جیپوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہ سب کی سب نہایت سخت جان جیپیں تھیں۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ جیپیں آرمی کے استعمال میں رہی تھیں۔ بعد ازاں انہیں نیلام کردیا گیا تھا۔ یہ جیپیں اب بھی بڑی اچھی حالت میں تھیں۔ دشوار گزار راستوں کو دھاڑتی چنگھاڑتی پھلانگتی چلی جاتی تھیں۔ ان علاقہ جات میں یہ جیپیں آمدورفت کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں‘ ہمیں ان علاقوں میں ہر جگہ ان جیپوں کی حکمرانی نظر آئی۔ وہاں اس جیب کے لئے پہاڑوں کی شہزادی کا لقب بجا طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ راستے میں ہم نے پہاڑوں کی شہزادی کا دیدار بے تحاشہ کیا تھا مگر اس شہزادی کی اصل طاقت اور صلاحیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ہماری ہم سفر بنی اور ہمیں ناران سے جھیل تک لے کر گئی۔

ان جیپوں میں عام طور پر آٹھ سے دس سواریوں کی گنجائش ہوتی ہے‘ بہرحال اکثر اوقات اوور لوڈنگ بھی کرلی جاتی ہے۔ ڈرائیور حضرات تین جیپوں کے لئے اٹھارہ سو

روپیا مانگ رہے تھے۔ ایک بار پھر ندیم کی چرب زبانی کام آئی اور میں نے ندیم کے ساتھ مل کر یہ معاملہ چودہ سو روپے میں نمٹالیا۔ اس کے علاوہ یہ سہولت بھی حاصل کرلی کہ ہم وہاں جھیل پر چار پانچ گھنٹے قیام کریں گے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں علی الصباح نو بجے کے لگ بھگ ناران سے روانہ ہونا تھا۔ قریباً سات آٹھ کلومیٹر کا سفر تھا۔ یہ انتہائی دشوار سفر ایک گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہوتا تھا۔ تین ساڑھے تین بجے تک ہمیں جھیل پر رکنا تھا۔ اس دوران میں ڈرائیور صاحبان آزاد تھے‘ وہ اپنی گاڑیوں سمیت جہاں چاہے جاسکتے تھے۔

خواتین نے قیمے اور آلو کے سینڈوچ بنانے کا سامان رات کو ہی تیار کرلیا تھا۔ علی الصباح سینڈوچ تیار کئے گئے‘ کولڈ ڈرنکس‘ فروٹ اور اس قسم کی دیگر اشیاء ساتھ لے لی گئیں۔ پروگرام کے مطابق ڈرائیور صاحبان ساڑھے آٹھ بجے جیپیں لے کر پہنچ گئے۔ سب سوار ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ ندیم کے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر تھا۔ وہ بوکھلایا بوکھلایا سا پھر رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بولا۔ "یار! نازیہ اور زوہیب کی کیسٹ نہیں مل رہی‘ وہی جس میں گانا تھا‘ ٹالی دے تھلے بے کے‘ ماہیا وے ماہیا‘ کریئے پیار دیاں گلاں۔"

میں نے کہا۔ "تم اس سے پہلے جیپ پر جھیل سیف الملوک گئے ہو؟"

"نہیں.......... لیکن یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"یہ بہت خطرناک راستہ ہے‘ بڑے بڑے سخت دل لوگ اللہ توبہ کرنے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرے ایک عزیز دوست مرزا جمیل کی طرح تمہیں بھی خدا یاد آئے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ کوئی نعتوں وغیرہ کی کیسٹ ڈھونڈو.......... یہ نازیہ شازیہ سب تمہیں بھول جائے گا۔"

جو میں نے کہا تھا‘ درست ثابت ہوا۔ جوں جوں جھیل کی طرف بڑھتے جائیں راستہ خطرناک ترین صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ راستہ کیا ہے ایک پُل صراط ہے۔ پہاڑ کے ساتھ ساتھ ایک سخت ناہموار پٹی ہے۔ اس پٹی پر سے دو جیپیں بمشکل گزر پاتی ہیں۔ نیچے سینکڑوں فٹ گہرائی میں آبی گزر گاہ ہے۔ یہ وہ پانی ہے جو جھیل سیف الملوک سے ایک بڑے دھارے کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہزاروں فٹ کی بلندی سے وہ شور مچاتا جھاگ اڑاتا آتا ہے اور دریائے کنہار کا حصہ بن جاتا ہے۔ جوں جوں ہم جھیل کی طرف بڑھتے

جارہے تھے' یہ سفید چمکیلا آبی دھارا گہرائی میں جارہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پتلی لکیر کی صورت میں نظر آنے لگا۔ اس پانی میں جگہ جگہ برف نے محرابیں سی بنا رکھی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ برف کے غار ہیں جن میں سے پانی فراٹے بھرتا گزر رہا ہے۔

میرے ہم سفروں کی حالت عجیب تھی۔ ان میں سے بیشتر پہلی مرتبہ اس وادیِ حسن میں آئے تھے اور پہلی مرتبہ پُل صراط سے گزر کر طلسمی جھیل کی طرف جارہے تھے' اخلاق میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ بولا۔ "کہتے ہیں کہ جنت پہنچنے سے پہلے پُل صراط سے گزرنا ہوگا۔ غالباً ٹھیک ہی کہتے ہیں۔"

بڑی تائی بھی اسی جیپ میں تھیں جس میں' میں بیٹھا تھا۔ ان کی حالت سب سے پتلی تھی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ گاہے گاہے ڈری نظروں سے سینکڑوں فٹ نیچے پہاڑی نالے کو دیکھتی تھیں اور جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرلیتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ منہ میں تیزی کے ساتھ کچھ بدبدانے بھی لگتی تھیں۔ فرحین نے انہیں اپنے بازو کے حصار میں لے رکھا تھا۔ شاید فرحین بھی کچھ پڑھ رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پر تائی کی طرح خوف وہراس کی یلغار نہیں تھی۔ ندیم بھی چپ تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو بس وہ لڑکی نہیں بھول رہی جو راستے میں ملی تھی۔ اتنا بھدا شوہر اتنی خوبصورت بیوی' چچ چچ.......... یہ تو بڑا ظلم ہے۔"

عینی سب سے زیادہ خوش نظر آرہی تھی۔ وہ چہک رہی تھی اور گاہے گاہے تالی بجا اٹھتی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کی خوشی میں جھوٹ کتنا تھا اور سچ کتنا.......... بہرطور ایک موقع پر تو عینی کو بھی چپ لگ گئی۔ سامنے سے آنے والی جیپوں کو راستہ دینے کے لئے ہماری جیپ کے ڈرائیور کو جیپ ریورس کرنا پڑی۔ جیپ لڑھکنے کے انداز میں چلتے ہوئے راستے کے بالکل کنارے پر جا لگی۔ بلامبالغہ جیپ کے دو ٹائر عین کنارے پر تھے اور کنارے کے پتھر ایسے تھے کہ کسی بھی وقت ہمیں خداحافظ کہہ کر ہزاروں فٹ گہرے نالے کی طرف روانہ ہوسکتے تھے۔ جیپ میں چھوٹے تایا کی پوتی بھی موجود تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھی تھی۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔

ندیم نے کہا۔ "یار' کتنے خوش نصیب لوگ ہیں وہ۔"

"کون؟" اخلاق نے مری مری آواز میں پوچھا۔

ندیم نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں پاپیادہ جھیل کی طرف جارہے تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان لڑکے لڑکیاں تھے۔ انہوں نے اشیائے خوردونوش کی ٹوکریاں اور تھرماس وغیرہ اٹھا رکھے تھے۔

"کیوں نہ ہم بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوجائیں' میرا مطلب ہے کہ جہاں تک راستہ خطرناک ہے' جیپوں سے اتر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو سو پیاز اور سو جوتوں والی بات ہوگئی۔ اب راستہ جھیل تک خطرناک ہی ہے۔"

ڈرائیور خوش باش شخص تھا۔ وہ دنیا کے اس خطرناک ترین راستے پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے زندہ دلی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ ہمیں لطیفے سنا رہا تھا اور ہنسنے ہنسانے کی باتیں کر رہا تھا۔ یہاں بھی ہمیں ایک بڑے گلیشیر پر سے گزرنا پڑا۔ کچھ جدت پسند دکان داروں نے برف کھود کر چھوٹی چھوٹی خوبصورت دکانیں تراش رکھی تھیں۔ ان دکانوں پر کولڈ ڈرنکس' سگریٹ اور سوئٹس وغیرہ دستیاب تھیں۔ عینی نے ان دکانوں کو "برفانی دکانوں" کا نام دیا۔

جھیل سے قریباً ایک کلومیٹر ادھر ہی جیپیں رک جاتی ہیں۔ اس کے بعد جھیل کے عشاق کو راہ پُرخار پر پاپیادہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اپنا خون خشک کرنے کے لئے گھوڑوں پر بھی سوار ہوجاتے ہیں۔ جھیل تک راستہ ایک تنگ پگڈنڈی کی شکل میں ہے۔ آپ میں اور آپ کے ہم سفر میں کتنی بھی محبت ہو مگر اس پگڈنڈی پر کچھ مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ آپ کندھے سے کندھا ملا کر نہیں چل سکتے۔ پگڈنڈی پر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے۔

پُل صراط کو.......... عبور کرکے اور حساب کتاب کے مراحل سے گزر کر جنت کو دیکھنے کی خوشی کا تو علم نہیں لیکن سیاحوں کے لئے جھیل سیف الملوک کو دیکھنے کی خوشی بھی یادگار ہوتی ہے۔ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے جیسے مدتوں سے اس کے اندر ایک بھری خلا تھا جو اس نیلگوں جھیل کو دیکھنے کے بعد پر ہوگیا ہے۔

مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح کچھ چیزیں اس لئے خوبصورت نظر آنے لگتی ہیں کہ ان کی خوبصورتی.......... جادو کی طرح سر چڑھ کر بولتی ہے اور جھیل سیف الملوک ان

میں سے ایک ہے۔ اس کے حسن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بہت اچھے طریقے سے لکھا جاچکا ہے۔ میرا قلم وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا' صرف اتنا کہوں گا کہ برف پوش پہاڑوں کے درمیان نیلے برفاب کا وہ منظر بتانے کی نہیں صرف دیکھنے کی چیز ہے۔ "سم سم" کے غار میں داخل ہونے پر جو حالت علی بابا کی ہوئی ہوگی وہی جھیل سیف الملوک کے روبرو پہنچنے والے کی ہوتی ہے۔ اسے اپنے اردگرد خوبصورتی کے ایسے خزانے نظر آتے ہیں کہ وہ دیوانہ سا ہوجاتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ ایک ہی وقت میں بہت سے مناظر دیکھ لے' ایک ہی لمحے میں بہت سی چیزوں کو چھولے۔

جھیل سیف الملوک سے بہت دیر والہانہ ملاقات کرنے کے بعد ہم کنارے کنارے ایک گلیشیر کی طرف چلے گئے۔ جھیل ایک پیالے کی طرح ہے اور اس میں چاروں طرف سے گلیشیر گرتے ہیں۔ انہی گلیشیرز کا پانی جھیل میں جمع ہوتا ہے اور ایک خوبصورت جھالر کی شکل میں جھیل سے نکل کر کوہی نالے میں پہنچ جاتا ہے۔

گلیشیر پر پہنچ کر گروپ کے ارکان نے کچھ دیر اودھم مچایا پھر سب ٹولیوں کی شکل میں بٹنے لگے۔ جس وقت یہ چھوٹے چھوٹے گروپ بن رہے تھے' میں فوراً اس گروپ میں شامل ہوگیا' جس میں عینی تھی۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ میں عینی کے ساتھ رہوں' مقصد کچھ اور تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں عینی والے گروپ میں شامل ہوں گا تو فرحین بھی ضرور ہمارے ساتھ شامل ہوجائیں گی۔ وہ یہ کبھی گوارا نہیں کریں گی کہ عینی پر اور مجھ پر ان کی نگاہ نہ رہے۔ میرا اندازہ سوفیصد درست ثابت ہوا۔ میں تنویر' ندیم اور عینی کے ساتھ شامل ہوا تو فرحین بھی بنو رضوان اور فوزیہ وغیرہ کے ساتھ رہنا چاہ رہی تھیں' ہمارے ساتھ چلی آئیں۔ اب ہم پارٹی میں کل پانچ ارکان تھے۔ یعنی میں' عینی' ندیم' تنویر اور فرحین۔ ہم جھیل کے ساتھ ساتھ چلتے اس کنارے کی طرف بڑھے جہاں عظیم الشان چوٹی ملکہ پربت سر اٹھائے کھڑی تھی اور آسمان کو بوسہ دے رہی تھی۔ جھیل کے کنارے سے ملکہ پربت کا نظارہ اتنا خوبصورت تھا کہ یہ خوبصورتی دہشت پیدا کردیتی تھی۔ ایک مفلوک الحال مقامی نوجوان مسلسل ہمارے تعاقب میں تھا۔ اس کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا اور وہ کھانے کو کچھ مانگ رہا تھا۔ ہم سامان خوردونوش پہلے گلیشیر پر چھوڑ آئے تھے۔ فرحین کے پرس میں چند چاکلیٹس تھیں' انہوں نے وہی دے دیں۔ پچاس ساٹھ روپے کی ہوں گی۔

چاکلیٹس لے کر بھی نوجوان نے ہمارا تعاقب جاری رکھا۔ اب وہ تقاضا کررہا تھا کہ ہم اس سے جھیل سیف الملوک کی کہانی سنیں۔ اس کہانی کا معاوضہ وہ بیس روپے طلب کررہا تھا۔ جب اس نے کسی طرح ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تو زچ ہوکر ہم کہانی سننے پر آمادہ ہوگئے۔ تاہم اسے باور کرادیا کہ ہم اس "تفریح بالجبر" کا ہرجانہ صرف دس روپے ادا کریں گے۔

ہم جھیل کے سرد پانیوں میں پاؤں کی انگلیاں ڈبو کر بیٹھ گئے۔ (پورے پاؤں نہیں ڈبوئے کیونکہ یہ پانی اتنا سرد ہے کہ خون منجمد کرکے ہاتھ پاؤں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیتا ہے) نوجوان کی کہانی شروع ہوئی۔ ویسی ہی کہانی جیسی ہم بچپن میں "بچوں کی دنیا" نامی رسالے میں پڑھا کرتے تھے۔ شہزادہ' شہزادی' دیو' زنداں' طلسم' سب کچھ اس میں موجود تھا۔ کہانی سے زیادہ اہم وہ لہجہ تھا جس میں وہ مقامی نوجوان کہانی سنا رہا تھا اور وہ گردوپیش اہم تھا جس میں ہم بیٹھے سن رہے تھے۔ جھیل کی عطربیز ہوا اہم تھی اور وہ چوٹی اہم تھی جسے ہم ملکہ پربت کے نام سے جانتے تھے اور جو کسی الف لیلوی داستان کے دیوہیکل کردار کی طرح لاکھوں سال سے اس جھیل کے کنارے سینہ تانے کھڑی تھی۔

دس روپے کے عوض ایک صدیوں پرانی کہانی سننے کے بعد ہم پھر چہل قدمی کے انداز میں جھیل کے ساتھ ساتھ روانہ ہوگئے۔ جلدی ہی ہم جھیل کے ایک دور افتادہ کنارے پر پہنچ گئے۔ یہاں دو برف پوش پہاڑوں کے درمیان رہ گزر سی بنی ہوئی تھی۔ ہوا یہاں سے سیٹی بجاتی ہوئی گزرتی تھی۔ چلنا خاصا دشوار تھا۔ کسی کسی جگہ تو برف اچانک پاؤں کے نیچے ٹوٹ جاتی تھی اور جسم کو شدید جھٹکا لگتا تھا۔ ایک جگہ برفاب پانی کا دھارا بہہ رہا تھا اسے پار کرنے کے لئے کسی نے دو پتھر پانی میں رکھ دیئے تھے۔ ان ناہموار پتھروں پر پاؤں رکھ کر گزرنا خاصا دشوار عمل تھا۔ ندیم' تنویر اور عینی تو بہ آسانی گزر گئے لیکن فرحین گزرنے لگیں تو ذرا ساڈگمگائیں۔ میں نے غیرارادی طور پر انہیں ہاتھ پیش کیا' وہ ایک دم جھجک کر پیچھے ہٹ گئیں۔ جیسے میں نے ہاتھ کے بجائے انہیں لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخ تھمانے کی کوشش کی ہو۔ میں خجل سا ہوکر آگے نکل گیا۔ وہ خود ہی سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی دھارا پار کر آئیں۔

مصیبت آتے دیر نہیں لگی۔ ہمارے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیروتفریح اور سیاحت کا یہ خوشگوار موڈ یوں آناً فاناً برباد ہوجائے گا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہمارے رواں

دواں تفریحی دورے کو یوں اچانک فل اسٹاپ لگ جائے گا۔ جو کچھ ہوا اتنے غیر محسوس طریقے سے ہوا کہ ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب ہم پریشانی کی دلدل میں گلے گلے تک دھنس گئے ہیں۔

ہم برفیلی ڈھلوان پر بیٹھ کر دم لے رہے تھے۔ چاروں طرف برف تھی لیکن پھر بھی ہلکی تپش موجود تھی اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ تنویر نے سفری بیگ میں سے کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں نکالیں، ہم بوتلیں پینے لگے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے پچاس ساٹھ گز نیچے کچھ نوجوان اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اپنے حلیے اور بول چال سے وہ اونچے خاندانوں کے چشم وچراغ لگتے تھے۔ لمبے بال، قیمتی عینکیں، بڑے بڑے امپورٹڈ جوگرز۔ ایک لڑکے کے پاس جدید ویڈیو کیمرا بھی تھا۔

عینی کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بوتل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور پھسلتی ہوئی دور نیچے لڑکوں کے پاس چلی گئی۔ لڑکوں نے بوتل اٹھائی اور شوخی میں "تھینک یو........ تھینک یو" کے آوازے بلند کرنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں، بوتل واپس کر دیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک لڑکے نے دانتوں سے بوتل کھولی اور غٹاغٹ چڑھانے لگا۔ دوسرے اس سے چھیننے لگے۔ زبردست دھماچوکڑی شروع ہو گئی۔ ہم سب خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

لڑکوں نے بوتل پینے کے بعد خالی بوتل واپس کرنا بھی گوارا نہیں کی اور بوتل وہیں پھینک کر ایک مرتبہ پھر دھینگا مشتی شروع کر دی۔ جس لڑکے کے پاس ویڈیو کیمرا تھا، وہ اس دھینگا مشتی کی فلم بندی میں مصروف ہو گیا۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی خیریت تھی لیکن پھر یوں ہوا کہ لڑکے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہمارے بالکل قریب آ گئے۔ لمبے بالوں والا کیمرا مین مسلسل ویڈیو فلم بنا رہا تھا۔ ظاہر ہے ہماری فلم بھی بن رہی تھی۔ ندیم نے لڑکوں کے پاس جا کر انہیں منع کیا اور کہا کہ وہ دوسری طرف چلے جائیں۔ ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور وہ مسلسل "ہائے ہاؤ" میں مصروف رہے۔

میں نے ندیم کو واپس بلا لیا، پھر عینی اور فرحین وغیرہ کو اشارہ کیا۔ ہم نے سامان سمیٹا اور آگے چل دیئے۔ ویڈیو کیمرا بار بار ہمیں فوکس کر رہا تھا۔ ندیم سے رہا نہیں گیا۔ اس نے کیمرا بردار لڑکے کے قریب جا کر کچھ کہا۔

شرمندہ ہونے کے بجائے وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ کیمرا دوسرے لڑکے کو تھما کر وہ ندیم سے تکرار کرنے لگا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔ ایسے ڈیڑھ پسلی کے غنڈے بہت دیکھے تھے میں نے........ اور بہت سوں سے نمٹا بھی تھا لیکن اس موقع پر میں پیچھے ہی رہنا چاہتا تھا، میں ہرگز ہرگز کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ میری وجہ سے کوئی مسئلہ کھڑا ہوا ہے اور سب کی تفریح برباد ہوئی ہے۔ کیمرا بردار لڑکے اور ندیم میں تھوڑی دیر تک تکرار ہوئی پھر لڑکے نے ندیم کو باقاعدہ دھکا دے دیا۔ ندیم کا رنگ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا لیکن معاملے کو بگڑنے سے بچانے کے لئے وہ خاموش رہا۔ اسی دوران میں، میں اور تنویر بھی موقع پر پہنچ گئے۔

ندیم غصے سے کانپ رہا تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "لیڈیز ساتھ ہیں ورنہ تمہاری بات کا جواب میں بڑے اچھے طریقے سے دے سکتا تھا۔"

تین چار لڑکوں نے ایک ساتھ منہ سے ہو کی طویل آواز نکالی، جیسے ندیم کو اس کے اچھے ڈائیلاگ پر داد دے رہے ہوں۔

ایک لمبا تڑنگا لڑکا جو انگلش لہجے میں اردو بول رہا تھا، منہ سے چچ چچ کی آواز نکال کر بولا۔ "جاؤ........ جان! جی........ اتنی سرد جگہ پر اتنی گرمی اچھی نہیں ہوتی، لقوہ شقوہ ہو جائے گا۔"

بظاہر وہ بات مٹانے کی بات کر رہا تھا لیکن انداز سخت تاؤ دلانے والا تھا۔ تنویر کا پارا بھی چڑھنے لگا۔ اسی دوران میں فرحین ہمارے نزدیک پہنچ گئیں۔ وہ ندیم اور تنویر کو واپس بلانے لگیں۔ "چھوڑو ندیم! ہمیں نہیں جھگڑا کرنا۔ آجاؤ واپس، دفع کرو ان کو۔"

میں ندیم اور لمبے لڑکے کے درمیان آ گیا اور ندیم کو دھکیل کر واپس لے آیا۔ تنویر بھی منہ میں بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹ آیا۔ سارا موڈ برباد ہو گیا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ گروپ کی طرف چل دیئے لیکن ابھی ہم تقریباً ایک فرلانگ دور ہی گئے تھے کہ ہمیں شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ لڑکے ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ دو تین کے سوا وہ سب شرارت کے موڈ میں تھے۔ کورس کی شکل میں وہ ایک بے ہودہ گانا گا رہے تھے اور تالیاں پیٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ تنویر اور ندیم غصے کے گھونٹ پی رہے ہیں۔ لڑکوں کی تعداد دس کے قریب تھی۔ لڑائی کی صورت میں یقیناً ان کا پلہ بھاری رہتا۔ یہاں اردگرد کوئی متنفس

دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان لمحوں میں مجھے اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ ایسے دور دراز تفریحی مقامات پر پولیس یا گارڈز وغیرہ کا اہتمام ہونا چاہئے۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ میں نے نگاہوں نگاہوں میں ان لوفر امیرزادوں کو تول لیا تھا۔ دو تین کے سوا ان میں سے کوئی بھی مارنے یا مار کھانے والا نہیں تھا۔ ایسے مشٹنڈوں کو طفیلی مشٹنڈے کہنا چاہئے۔ گروپ میں شامل ہو کر وہ طرم خان بن جاتے ہیں لیکن اگر کہیں پھڈے وغیرہ کا معاملہ ہو جائے تو وہ سر پر پاؤں رکھ لیتے ہیں اور ان کی دوڑ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اگر دوڑ نہ سکیں تو پھر ایسے مشٹنڈے فوراً تحمل مزاجی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور صلح صفائی کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں دو چار منٹ میں ان بدبختوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتا ہوں۔ مگر مسئلہ پھر وہی "ریپوٹیشن" کا تھا۔ برادری میں مجھے پہلے ہی آوارہ گرد' بدقماش اور ہتھ چھٹ جیسے معزز القابات سے یاد کیا جاتا تھا۔ اگر میں یہاں مارا ماری شروع کر دیتا تو مطلب یہ ہوتا کہ میں نے اپنے اوپر لگائے جانے والے تمام جھوٹے سچے الزامات کا ٹھوس ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اس معاملے میں سب سے پیچھے ہی رہوں گا۔

ہماری خاموشی دیکھ کر لڑکوں کا حوصلہ مزید بڑھا۔ وہ آپس میں نورا کشتی کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے اور برف کے گولے مارنے لگے۔ لڑتے جھگڑتے وہ ہمارے بالکل قریب آ گئے۔ برف کا ایک گولا عینی کی پشت پر لگا۔ ایک لڑکا جس نے نیکر پہن رکھی تھی' تنویر سے ٹکرایا اور تنویر گرتے گرتے بچا۔ یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ ایسے لوگوں کی خصلت مجھے اچھی طرح معلوم تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر ندیم اور تنویر تھوڑی دیر مزید خاموش رہے تو یہ مشٹنڈے دست درازی کرنے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔

ندیم کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ برف پر پھینکا اور نیکر والے لڑکے کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ لوگ تو جیسے شاید بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ تین چار لڑکے ایک دم ندیم اور تنویر پر پل پڑے.......... عینی اور فرحین کے چہرے برف ہی کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ عینی چیخنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ فرحین نے لاچار نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ

کچھ کرو اور کچھ نہیں تو کسی کو بلا کر ہی لاؤ۔

میں نے بڑے اطمینان سے اپنا کیمرا فرحین کو تھمادیا۔

"کیا کرو گے؟" فرحین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"آپ دیکھتی رہیں۔" میں نے جواب دیا اور ان لڑکوں کی طرف بڑھا جو کالی بھڑوں کی طرح ندیم اور تنویر سے چمٹ گئے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو دو لڑکے مجھ پر جھپٹے۔ ان میں سے ایک وہی لمبا تڑنگا لڑکا تھا جس نے ندیم سے الجھنا چاہا تھا اور جو انگریزی لہجے میں منہ ٹیڑھا کر کے اردو بولتا تھا۔ وہ خاصا قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی موٹی چین چمک رہی تھی۔ دوسرا لڑکا دبلا پتلا تھا' اس کے بال شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ لمبے تڑنگے لڑکے نے آتے ساتھ ہی مجھے مکا رسید کرنا چاہا۔ میں نے بڑے اطمینان سے یہ وار بچایا' پھر میرا ہاتھ دوسرے لڑکے کے لمبے بالوں پر آیا' میں نے مضبوطی سے اس کے بال پکڑے اور پوری قوت سے گھما کر اسے لمبے تڑنگے لڑکے پر دے مارا۔ دونوں پھسلے اور برف پر دور تک لڑھک گئے۔ لمبا لڑکا بے تحاشا گالیاں بکنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ برف سے اٹھتا' میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے وزنی بوٹ پہن رکھے تھے' چہرے پر لگنے والی ایک زوردار ٹھوکر نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ لمبے بالوں والا لڑکا ایک لمحے کے لئے تذبذب میں نظر آیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ مجھ سے لپٹ جائے یا ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لئے کوئی شے ڈھونڈے۔ اس ایک لمحے کا تذبذب اسے مہنگا پڑا۔ میں نے گریبان پکڑ کر اس کے جبڑے پر ایک دھواں دھار ٹکر رسید کی۔ وہ چیختا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں ایک اور لڑکا میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں وزنی بکل والی بیلٹ لہرا رہی تھی۔ میں نے بیلٹ اس سے چھین لی اور پانچ دس سیکنڈ کے اندر اس کا بھرتا بنا دیا۔ اس کی قمیض پھٹ گئی اور ٹیلی اسکوپ ٹوٹ پھوٹ گئی۔

تنویر اور ندیم نے جب یہ دیکھا کہ میں لڑکوں کی درگت بنا رہا ہوں تو ان کا حوصلہ بھی بلند ہوا۔ تنویر نے زمین سے چیڑ کی ایک موٹی شاخ اٹھائی اور اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ ندیم بھی ایک تنومند لڑکے کے نیچے سے نکل آیا اور اسے رگڑے دینے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر پانسا پلٹ گیا۔ وہی ہوا جس کا میں نے پیشگی اندازہ لگایا تھا۔ اس گروپ میں سے تین چار لڑکے "جنگ بندی" کے لئے دہائی دینے لگے۔ وہ چیخ رہے تھے

اور مارا ماری روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی اور عینک والا ایک لڑکا بار بار میری ٹھوڑی کو ہاتھ لگانے لگا اور درخواست کرنے لگا کہ میں اس لڑکے کو چھوڑ دوں جس کی گردن میں، میں نے بیلٹ لپیٹ رکھی تھی اور برف پر پٹخ رہا تھا۔ اسی دوران میں دور سے مجھے اپنے گروپ کے باقی ارکان بھی دکھائی دینے لگے۔ دراصل جب لڑکوں کے ساتھ ہماری مارا ماری شروع ہوئی تھی عینی نے موقع سے دوڑ لگادی تھی اور تقریباً ایک فرلانگ آگے جاکر چیخ و پکار کی تھی جس کے بعد گروپ کے وہ ارکان جو سامان کے پاس موجود تھے، دوڑے چلے آئے تھے۔ ان کے ساتھ چند مقامی افراد بھی تھے.........

میرا ارادہ یہی تھا کہ ان غنڈا صفت لڑکوں کو مزید پھینٹی لگائی جائے لیکن ان لڑکوں کے وہ ساتھی جو اَب بیچ بچاؤ کرا رہے تھے، میرے اور ندیم کے سامنے دیوار بنے کھڑے تھے۔ دو لڑکوں نے تنویر کو جپھی ڈال رکھی تھی۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر یہ معاملہ صلح صفائی پر ختم ہوگیا لیکن چہروں پر کشیدگی دونوں طرف موجود تھی۔ خاص طور سے جن تین چار لڑکوں کو زیادہ چوٹیں آئی تھیں، وہ بپھرے ہوئے نظر آتے تھے اور اپنی حرکات و سکنات کے ذریعے یہ "پیغام" دے رہے تھے کہ یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوجائے گا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ جس وقت ہم جیپوں میں جھیل سیف الملوک کی طرف روانہ ہوئے تھے افراتفری میں بڑی تائی جان اپنی ایک قیمتی گرم شال کمرے کے دروازے پر ہی چھوڑ گئی تھیں۔ اردگرد کئی غریب صورت مقامی بچے موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر بچے خوش ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ ہماری چادر (جس کے ساتھ پندرہ بیس روپے بھی تھے) کرسی پر پڑی رہ گئی تھی۔ تائی جان نے فوراً یہ پیسے بچوں میں بانٹ دیئے اور چادر سینے سے لگالی۔ اس واقعے سے پہلے ہمارے کچھ ساتھیوں کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ شاید یہ بچے جو غربت کی انتہا کو چھو رہے ہیں اور ہمارے کمروں کے باہر اکثر ڈبل روٹی کے ایک ٹکڑے کے منتظر رہتے ہیں......... موقع ملنے پر چوری چکاری بھی کرلیتے ہوں گے۔ مگر انہوں نے ہمارا یہ خیال غلط ثابت کردیا تھا۔

☆------☆------☆

اس رات اور اگلے دن بھی جھیل پر ہونے والی "بدمزگی" زیرِ بحث رہی۔ بڑے تایا بار بار شکی نظروں سے میری جانب دیکھتے تھے۔ غالباً معتبر گواہوں کے باوجود ان کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ جھیل پر ہونے والا جھگڑا میری وجہ سے بڑھا ہے۔ میرے لئے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔

اگلے روز سہ پہر کو میں اخلاق اور عینی بازار میں گئے۔ شام کے کھانے کے لئے مرغی کا گوشت لینا تھا۔ گوشت خریدتے ہوئے دکان دار سے مچھلی کی بات چل نکلی۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ ہم نے ناران میں ہونے کے باوجود ابھی تک "ٹراؤٹ" تو کھائی ہی نہیں۔ ٹراؤٹ مچھلی یہاں کی سوغات ہے اور بہت سے لوگ ناران پہنچ کر سب سے پہلے ٹراؤٹ کی تلاش میں ہی نکلتے ہیں۔ ہمیں آج یہاں چوتھا دن تھا اور ٹراؤٹ کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

جب یہ بات مرغی فروش محمد اسحاق کو معلوم ہوئی تو وہ بھی ہنسنے لگا۔ بولا۔ "صاحب! آپ بھی عجیب لوگ ہو۔ لوگ یہاں صرف ایک رات کے لئے آتے ہیں اور ٹراؤٹ کھا کر چلے جاتے ہیں۔ آپ چار روز سے یہاں پڑے ہو اور ابھی تک ٹراؤٹ نہیں ملی آپ کو۔"

میں نے کہا۔ "بھئی ملنے یا نہ ملنے کی بات نہیں۔ ہمارے ذہن میں تو خیال ہی نہیں آیا۔"

"یہ تو اور بھی بری بات ہے جی۔ بندہ ناران میں ہو اور اسے ٹراؤٹ کا خیال نہ آئے۔"

محمد اسحاق نے اسی وقت دو لڑکے بھگائے کہ وہ ٹراؤٹ کا پتا کریں۔ دس پندرہ منٹ بعد لڑکے واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ آج جتنے دانے پکڑے گئے تھے، وہ سارے

بک گئے ہیں۔ اب کل ہی امید کی جاسکتی ہے۔

محمد اسحاق نے پوچھا۔ "ہم کتنے دن یہاں ہیں؟"

اخلاق بولا "شاید کل کا دن ہی رکیں گے۔"

"پھر تو کل آپ کو ضرور مچھلی ملنی چاہیے۔" اسحاق نے کہا۔

اس کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کل مچھلی کی قیمت......... طلب اور رسد کے حساب سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مثلاً دو دن پہلے دریا سے بہت کم مچھلی پکڑی گئی تھی۔ خریدار زیادہ تھے۔ پون پون کلو کے دو دانے ایک ہزار روپے میں فروخت ہوئے تھے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ندیم اور رضوان بھی وہاں چلے آئے۔ بظاہر وہ نارمل نظر آرہے تھے لیکن بغور دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی آنکھوں میں پریشانی کی جھلک ہے۔ میرے پوچھنے پر ندیم نے بتایا کہ کل جھیل پر ملنے والے لڑکے ناران میں ہی موجود ہیں۔ ابھی بازار میں ان سے ملاقات ہوئی ہے۔

"کوئی بات بھی ہوئی ہے یا صرف دیکھا ہی ہے۔"

"بس دیکھا ہی ہے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ رہے تھے بلکہ گھور رہے تھے۔"

"خیر یہ تو کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "نوجوان لڑکوں کے ایسے گروپ زیادہ دیر ایک جگہ نہیں ٹکتے۔ ہوسکتا ہے کہ آج ہی یہاں سے روانہ ہوجائیں۔ اگر نہ گئے تو کل چلے جائیں گے۔"

گھر آکر ندیم نے چپکے سے بتایا کہ لڑکوں سے صرف آنکھیں ہی چار نہیں ہوئیں۔ ان سے بات بھی ہوئی ہے۔ ان میں وہ لمبا تڑنگا لڑکا بھی موجود تھا جسے میں نے خصوصی چھینٹی لگائی تھی۔ اس لڑکے نے بازار میں ندیم کو کھلم کھلا دھمکی دی تھی کہ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوجائے گی' بہت آگے تک جائے گی۔

میں نے ندیم کا کندھا تھپ تھپایا۔ "یار! گھبرانے کی بات نہیں۔ میں جو ہوں یہاں......... سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ویسے تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے کہ عینی کے سامنے یہ سب کچھ نہیں بتایا' خواہ مخواہ سب کی تفریح برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رضوان کو بھی سمجھادو کہ کسی سے بات نہ کرے۔"

اگلے دو روز تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ غنڈوں کی اس ٹولی میں سے ایک دو لڑکے ناران کے بازار میں گھومتے پھرتے نظر آئے۔

تیسرے روز ہم ناران سے واپس روانہ ہوگئے۔ واپسی کا یہ سفر بھی خاصا دلچسپ تھا۔ سب سے بڑی دلچسپی تو سفر کے آغاز میں ہی پیش آگئی۔ جس آخری گلیشیر کو پار کرکے ہم ناران میں داخل ہوئے تھے وہ واپسی کے سفر میں پہلا گلیشیر تھا۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہ گلیشیر ہمیں یوں ناکوں چنے چبوائے گا۔ ہم تو درمیان والے گلیشیر سے ڈرے ہوئے تھے کہ وہ زیادہ لمبا اور دشوار گزار تھا۔ ناران سے روانہ ہونے کے بعد جونہی ہم نے گلیشیر کو پار کرنا چاہا' اس نے ہمیں اذن روانگی دینے سے صاف انکار کردیا۔ گلیشیر کی برفیلی ڈھلوان پر چڑھنے سے ہماری گاڑیاں قطعی انکاری ہوگئیں۔ ایکسیلیٹر دبایا جاتا تھا تو پہیے گھومنا شروع کردیتے تھے۔ ہم گاڑیوں کو پیچھے سے دوڑا کرلاتے تھے لیکن ڈھلوان پر پہنچتے ہی وہ بے بس ہوجاتی تھیں۔ قریباً ایک گھنٹا وہاں تماشا لگا رہا۔ آخر موقع پر موجود ایک صاحب نے ہمیں اپنی ماہرانہ خدمات پیش کیں۔ انہوں نے گاڑی کے اگلے پہیوں کے عین اوپر بونٹ پر دو لڑکے بٹھائے تاکہ پہیوں پر وزن رہے اور وہ گھومنے کی کوشش نہ کریں۔ ڈرائیونگ سیٹ ان صاحب نے خود سنبھال لی۔ کچھ افراد نے پیچھے سے دھکا لگایا' یوں ہماری گاڑی' لہراتی بل کھاتی آگے بڑھی اور پل صراط پار کرنے میں کامیاب رہی۔ باقی دونوں گاڑیوں کو بھی اسی طرح "رحمت کے اس فرشتے" نے پل صراط پار کرایا۔ آخر میں اسٹیشن وین بھی کسی نہ کسی طرح اس مرحلے سے گزر گئی لیکن جب ہم اس شخص کا پُرخلوص شکریہ ادا کرکے آگے بڑھنے لگے تو معلوم ہوا کہ رحمت کا یہ فرشتہ اس "رحمت" کے پیسے وصول کرتا ہے یعنی وہ شوقیہ نہیں پیشہ ور فنکار تھا۔ اس نے فی گاڑی پندرہ روپے کا تقاضا کیا جو ہم نے بخوشی اسے دے دیئے اور اپنا "شکریہ" دل ہی دل میں واپس لے لیا۔

ناران سے کاغان تک واپسی کا سفر بھی حسنِ فطرت کی باغ وبہار وادی میں طے ہوا۔ یہ جنت نظیر مقامات دیکھ کر انسان دماغی و روحانی طور پر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میرا قلم اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہے جو اس مختصر سفر کے دوران میں اکثر مجھ پر طاری ہوا کرتی ہے۔

ہم قریباً ایک بجے کاغان پہنچے' ہماری منزل شوگران تھا۔ کاغان سے آگے کیوائی کا قصبہ ہے۔ کاغان میں ہم نے پندرہ بیس منٹ قیام کیا۔ بچوں کے لئے بسکٹ چپس وغیرہ لئے اور کیوائی کے لئے روانہ ہوگئے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم کیوائی پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ کیوائی سے بائیں جانب شوگران جانے والی سڑک نکلتی ہے۔ مین روڈ اور شوگران روڈ کے سنگم پر ایک اچھا ریستوران موجود ہے۔ سلجوق بزعم خود پارٹی لیڈر بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اس ریستوران سے کھانا کھالیتے ہیں۔ سب کو بھوک لگی ہے اور گاڑیاں بھی گرم ہیں۔ ہماری پیٹ پوجا ہوجائے گی اور گاڑیوں کو ذرا ریسٹ مل جائے گا۔ سلجوق نے مجھے فوراً سڑک کے کنارے پر نصب سنگ میل دکھا دیا۔ سنگ میل پر لکھا تھا۔ "شوگران سات کلومیٹر۔" وہ بولا۔ "بھائی صاحب! پچاس ساٹھ کلومیٹر تو آگئے ہیں' اب سات کلومیٹر رہ گیا ہے' شوگران چل کر ہی کھائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ جو سات کلومیٹر رہ گیا ہے' یہ پچھلے ساٹھ کلومیٹر پر بھاری ہے' بہت چڑھائی ہے۔"

ایک دو آوازیں میرے حق میں آئیں لیکن زیادہ آوازوں نے سلجوق کا ساتھ دیا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ سات کلومیٹر کی تو بات ہے' اب منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔

عینی میری ہم خیال تھی۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ "اچھا ووٹنگ کرلیتے ہیں جس جس کو بھوک لگی ہے وہ ہاتھ کھڑا کردے۔"

ظاہر ہے کہ بھوک تو سب کو لگی تھی۔

فرحین صاحبہ نے گھور کر عینی کو دیکھا اور کہا۔ "تم زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ بے شک بھوک سب کو لگی ہے لیکن سلجوق کہہ رہا ہے کہ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔"

فرحین کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو ٹالنے کی ہمت کس میں تھی' لہٰذا سب بڑی خاموشی سے شوگران کی طرف روانہ ہوگئے۔

شوگران کی چڑھائی اپنی مثال آپ ہے۔ اسے عمودی چڑھائی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اکثر گاڑیاں دوسرے گیئر میں بھی چڑھنے سے انکار کردیتی ہیں اور انہیں پہلے گیئر میں لانا پڑتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمیں اپنے پہلو میں نظر آنے والا دریائے کنہار پتلی سی سفید لکیر دکھائی دینے لگا۔ ہم برق رفتاری سے بلند تر ہوتے جارہے تھے۔ اس چڑھائی میں

ایک مصیبت یہ ہے کہ گاڑی کو کہیں دم لینے کا موقع نہیں ملتا۔ بس ایک سیڑھی ہے جس پر چڑھتے ہی چلے جانا ہے۔ اگر کہیں گاڑی رک جاتی ہے تو ڈھلوان اتنی زیادہ ہے کہ اسے دھکا لگائے بغیر آگے نہیں لے جایا جاسکتا۔ دو تین کلومیٹر طے کرکے ہی ہماری گاڑیاں ہانپ گئیں۔ ہماری گاڑی کی ٹمپریچر بتانے والی سوئی انتہا سے تھوڑا ہی پیچھے رہ گئی تھی۔ انجنوں کے شور سے گاڑیوں کی حالت زار کا بخوبی اندازہ ہورہا تھا۔ قریباً آدھا گھنٹا چلنے کے بعد گاڑیاں بے دم ہوگئیں۔ ایک موڑ پر تھوڑی سی ہموار جگہ نظر آئی۔ میرے کہنے پر ندیم نے گاڑی وہاں روک لی۔ ہماری دیکھا دیکھی باقی چاروں گاڑیاں بھی وہاں رک گئیں۔ جگہ تھوڑی تھی گاڑیاں ایک دوسرے میں گھسی ہوئی تھیں۔ ان کے پچھلے پہیوں کے نیچے پتھر رکھ دیئے گئے تھے۔ سب لوگ باہر نکل آئے اور بلند وبالا درختوں میں سیٹیاں بجاتی ہوا کا ترنم سننے لگے۔ تیس چالیس منٹ کے اندر ہم ہزاروں فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے تھے۔ گردو پیش ویسے ہی تھے جیسے بلند ترین پہاڑی مقامات یعنی نتھیا گلی اور ٹھنڈیانی وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ اخلاق نے چاروں گاڑیوں کے بونٹ کھلوا دیئے۔ مہران کا بونٹ کھولنے کے لئے ندیم گاڑی کے قریب گیا تو اندر سے سوں سوں کی تیز آواز آئی۔ دھواں بھی خارج ہورہا تھا۔ احتیاط سے بونٹ کھولا گیا تو بھاپ ایک تیز فوارے کی طرح کئی فٹ اوپر گئی' گاڑی کا ہاؤس پائپ لیک کرچکا تھا۔ دیگر گاڑیوں کے ریڈی ایٹر بھی ابالے کھا رہے تھے۔

سلجوق جو کیوائی میں رکے بغیر اوپر جانے کے سلسلے میں سب سے زیادہ پرجوش تھا اب سب سے پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ آخر اس کی نئی نویلی مارگلہ گاڑی کا معاملہ تھا۔ مایوسی کی انتہا کو چھو کر وہ بولا۔ "میرا تو خیال ہے کہ دفع کریں شوگران کو' واپس چلتے ہیں۔ کیمپنگ ہی کرنی ہے' کہیں آگے چل کر کرلیں گے' یہ چڑھائی تو گاڑیوں کی جان لے لے گی۔"

اس کی مایوسی جب پورے گروپ کو گھیر رہی تھی' میں ٹہلتا ہوا سڑک کی طرف چلا گیا۔ اگلے موڑ کے ساتھ ہی سنگِ میل موجود تھا۔ لوہے کی ایک پرانی سی زنگ آلود تختی تھی۔ تختی پڑھ کر مجھے خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں فوراً واپس آیا اور گروپ کے باقی ارکان کو بھی یہ تختی دکھائی۔ اس پر لکھا تھا۔ "شوگران ایک کلومیٹر" دراصل فاصلے کا

احساس میرے ذہن سے بھی نکلا ہوا تھا۔ ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ شوگران کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ گروپ میں ایک بار پھر جان دوڑ گئی۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ سلجوق کی باتوں میں آکر سچ مچ واپس ہی روانہ نہیں ہوگئے ورنہ وہ ان بد نصیبوں میں شامل ہوجاتے جو منزل کے بالکل قریب پہنچ کر ہمت ہار دیتے ہیں اور پلٹ جاتے ہیں۔ قریبی چشمے سے پانی لے کر گاڑیوں کے انجن ٹھنڈے کیے گئے۔ ٹائروں پر پانی ڈالا گیا۔ پھٹے ہوئے ہاؤس پائپ کو تنویر نے ٹیپ کے ذریعے مرمت کردیا۔ ہنڈا گاڑی کا انجن فین جواب دے گیا تھا۔ اسے چالو کیا گیا۔ قریباً آدھ گھنٹا ریسٹ کرنے کے بعد ہم شوگران پہنچ گئے۔

شوگران بھی دیکھنے کی جگہ ہے۔ یہ ایک ابھرتا ہوا ہِل اسٹیشن ہے اور جو ایک بار یہاں آتا ہے' دوبارہ آنے کی خواہش ضرور کرتا ہے۔ اب کئی ایک نہایت عمدہ ہوٹل یہاں بن گئے ہیں جن میں سرحد کے ایک معروف سیاست داں کا فائیو اسٹار ہوٹل بھی شامل ہے۔ زندگی کی ہر سہولت یہاں میسر ہے۔ سڑکوں پر خاصی چہل پہل نظر آتی ہے۔ یہ پہاڑ مری سے ہزاروں فٹ بلند ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں پتھریلی چٹانوں کے بجائے سرخی مائل مٹی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں کھیت بھی ہیں جنہیں دیکھ کر بالکل یوں لگتا ہے جیسے ہم پنجاب کے کسی گاؤں میں گھوم رہے ہیں۔ اردگرد کے مناظر دلنواز ہیں۔ فلک بوس چوٹیاں سروں پر برف کے تاج پہنے ایستادہ نظر آتی ہیں۔ نگاہ ان مناظر میں کہیں کھو کر رہ جاتی ہے۔ مشہور مکڑا پہاڑ یہاں سے نو دس کلومیٹر کی دوری پر ہے۔

ہمیں ایک اچھے ہوٹل میں مناسب قیمت پر چار کمرے مل گئے۔ کمروں میں سامان وغیرہ رکھنے کے فوراً بعد ہم نے پیٹ پوجا کی۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ یہ لنچ تھا اور نہ سپر' دونوں کا مجموعہ تھا۔ گہری کھائیوں کے کنارے لکڑی کے بنے ہوئے ایک سادہ سے ہوٹل میں کھایا جانے والا یہ کھانا ہمیں "فائیو اسٹار ہوٹل" کا مزہ دے گیا۔

رات کو سب تھک کر سوگئے۔ اگلا دن بھی شوگران کے خوبصورت نشیب و فراز میں گھومتے ہوئے گزرا۔ عینی بدستور میرے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری طرف فرحین صاحبہ کی نگاہیں بھی بدستور میری اور عینی کی نگرانی کر رہی تھیں۔ یہ ناراض نگاہیں جیسے ہمہ وقت مجھ سے چپکی رہتی تھیں............ شوگران میں موجود سرسبز

میدان اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ ایک ایسا ہی وسیع و عریض میدان محکمہ جنگلات کا بھی ہے۔ گروپ کے ارکان سارا دن یہاں بھاگتے دوڑتے رہے اور دھوپ سینکتے رہے۔ اتنی بلندی پر ایسا ہموار میدان شوگران کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔

شام کو میرا دل کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اتنے سارے لوگوں میں بھی میں بالکل تنہا ہوں۔ میرے ہم سفر حقیقت میں میرے ہم سفر نہیں تھے۔ وہ کسی اور دنیا کی مخلوق تھے۔ میں کسی اور سیارے کا باسی تھا۔ ایک مجبوری کے تحت وہ مجھے برداشت کر رہے تھے۔ اگر آج وہ مجبوری ختم ہوجاتی تو وہ آج ہی مجھے اپنا بستر بوریا گول کرنے کا حکم دے دیتے۔ پورے گروپ میں صرف عینی' اخلاق اور ندیم تھے جو دل سے مجھے اپنا ہم سفر سمجھ رہے تھے۔ ان تینوں میں سے عینی میرے زیادہ قریب آگئی تھی۔ وہ اکثر چور نظروں سے مجھے تکتی رہتی۔ کسی وقت موقع ملتا تو میرے کانوں میں کوئی چنچل سرگوشی کرجاتی۔ کسی وقت سب کی نظر بچا کر میرا ہاتھ دبا دیتی' ایک دو موقعوں پر ایسا بھی ہوا کہ اس نے چند لمحوں کے لئے مکمل تنہائی ڈھونڈلی اور میرے قریب آنا چاہا لیکن میں نے اس حوالے سے ہر بار اس کی حوصلہ شکنی کی اور اپنی حدود میں رہا۔

اپنے طور پر میں حتی الامکان عینی سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بات کرنے کا ذرا سا بھی موقع ملے............ مجھے اپنے گروپ میں اپنی ریپوٹیشن اچھی طرح معلوم تھی۔ میں کسی قیمت پر اس ریپوٹیشن کو مزید بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس شام میں گروپ سے الگ ہو کر اکیلا ہی درختوں میں نکل گیا۔ ایک درخت تلے ندیم نیم دراز تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ حسبِ معمول مزاحیہ انداز میں بولا۔ "مجھے تو بھائی جان' اس بے چاری لڑکی کا غم نہیں بھول رہا ہے۔ اف توبہ............" میں اس کی باتوں میں الجھے بغیر آگے بڑھ گیا............ ہموار میدان کے آخری کنارے پر جہاں سے کھائی شروع ہوجاتی تھی۔ اخلاق اور نرگس ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ان سے نگاہیں چراتے ہوئے میں ڈھلوان پر اتر گیا۔ کچی زمین پر چلتے ہوئے بالکل یوں لگتا تھا کہ میدانی علاقے میں چل رہا ہوں لیکن جب اپنے سامنے نگاہ اٹھتی تھی اور دنیا کی بلند ترین چوٹیاں نظر آتی تھیں تو اندازہ ہوتا تھا کہ میں فرش پر نہیں عرش پر ہوں۔ شوگران میں سیبوں کے بہت سے خود رو درخت

ہیں۔ ان درختوں پر چھوٹے سائز کے کچے پکے سیب بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے ایک درخت سے کچھ نیم پختہ سیب توڑے اور دانتوں سے کچل کچل کر ان کا رس چوستا ہوا نیچے درختوں میں چلا گیا۔ ایک پتھر پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور دلنواز پہاڑی خاموشی کو حیات بخش ہوا میں گھول گھول کر اپنے اندر اتارنے لگا۔ دفعتاً ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" یہ فرحین صاحبہ کی آواز تھی۔

"کیوں نہیں.......... کیوں نہیں؟" میں جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

ویسے میں اس تنہائی میں فرحین کی آمد پر حیران رہ گیا تھا اور کچھ پریشان بھی ہوا تھا۔ کوئی ہمیں اس تاریکی میں اس طرح بیٹھے دیکھ لیتا تو پتا نہیں کیا سمجھتا۔

وہ آسمانی رنگ کی ساڑھی میں ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور باوقار نظر آرہی تھیں۔ ایک ایسی ہستی جسے دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ اس کی عزت کی جائے.......... اس سے محبت کی جائے۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گئیں، ان کا رنگین آنچل دھیرے دھیرے ہوا میں لہرا رہا تھا۔

وہ بولیں۔ "میں آپ سے ایک اہم بات کہنے آئی ہوں۔" ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا.......... بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

"جی فرمائیں۔"

"میں آپ سے عینی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" ان کے الفاظ اور لہجے نے قرب وجوار کے حسن کو ایک دم گہنا دیا۔

"میں سن رہا ہوں۔" ایک سرد آہ بھر کر میں نے کہا۔

پُر سوچ توقف کے بعد وہ بولیں۔ "آپ مجھے شکل سے سمجھ دار لگتے ہیں، پڑھے لکھے بھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے رویئے پر غور کریں۔"

"کیوں، میرے رویئے کو کیا ہوا ہے؟"

"اس سوال کا جواب آپ خود سے پوچھیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔" فرحین نے مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "عینی نوجوان ہے، شوخ طبع اور لاابالی ہے۔ اگر آپ اس کے مزاج سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے تو یہ بہت غلط ہوگا۔"

"میں حتی الامکان اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ تم اسے صاف کہہ سکتے ہو کہ وہ تم سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرے۔"

فرحین آپ سے تم پر آ گئی تھی۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ اسے "تم" کہہ ڈالوں لیکن خبر نہیں کہ کیا چیز آڑے آ گئی۔ میں نے کہا۔ "میرے خیال میں آپ اپنا قیمتی وقت برباد کر رہی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے سمجھانے کے بجائے اسے باندھنے کی کوشش کریں۔"

میں نے جوابی طور پر سخت لہجہ اختیار کیا تو فرحین ذرا نرم پڑ گئیں۔ ان کا لہجہ بھی دھیما پڑ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہم وہاں مصروفِ گفتگو رہے۔ فرحین صاحبہ، عینی کا نفسیاتی تجزیہ کرتی رہیں۔ بتاتی رہیں کہ وہ کوئی قدم سوچ سمجھ کر نہیں اٹھاتی نہ ہی اس کے کسی فیصلے میں پائیداری ہوتی ہے۔ وہ ایک جذباتی لڑکی ہے اور اکثر نقصان بھی اٹھاتی ہے۔ فرحین صاحبہ کا تجزیہ تھا کہ میں عینی کی نادانی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جو سراسر غلط ہے اور میرے لئے بہت نقصان دہ بھی ہے کیونکہ برادری میں پہلے ہی میرا امیج زیادہ اچھا نہیں ہے۔ میرے لئے بہتر یہی ہے کہ میں عینی کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کی کوشش کروں اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔ نہ صرف اس ٹور کے دوران میں بلکہ بعد میں بھی عینی سے کوئی رابطہ نہ رکھوں۔

فرحین کی شخصیت میں وقار کا کوئی ایسا پہلو تھا کہ میں کوشش کے باوجود ان کی چبھتی ہوئی باتوں کے جواب چبھتے ہوئے لہجے میں نہیں دے پا رہا تھا۔ بہرحال میں نے ان سے وعدہ کیا کہ عینی سے دور رہنے کی پوری کوشش کروں گا۔

شام اب گہری ہو چکی تھی۔ شوگران میں برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ کسی ریسٹورنٹ میں بجنے والے ڈیک کی آواز ان درختوں تک پہنچ رہی تھی۔ غم ہے یا خوشی ہے تو.......... میری زندگی ہے تو۔

فرحین نے بتایا کہ وہ بازار جانے کا بہانہ کر کے یہاں آئی تھی۔ اب انہیں جانے کی جلدی تھی، وہ واپس چلی گئیں۔ میں دس پندرہ منٹ مزید وہاں بیٹھا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ فرحین اب تک ایک ایسے مسئلے کے لئے سر کھپاتی رہی تھیں جو سرے سے موجود ہی

نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں عینی کا خیال دل سے نکال دوں جبکہ عینی کا خیال یہاں تھا ہی نہیں۔ یہاں تو کسی اور کا خیال تھا۔ اور یہ خیال بڑی تیزی سے دل ودماغ کے قریبی اور دور افتادہ گوشوں تک پھیلتا چلا جارہا تھا۔ ایک سحر تھا جو مجھے غیر محسوس طور پر جکڑ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو شخص یہاں میرا ناصح بنا بیٹھا تھا وہی میرا محبوب تھا۔ شاعر حضرات ناصح سے کنی کتراتے ہیں کہ وہ انہیں محبوب سے جدا کرنا چاہتا ہے لیکن یہاں یہ انوکھا واقعہ ہوا تھا کہ ناصح ہی صنم بن گیا تھا۔ ایک ایسا صنم جسے اپنے گردوپیش کی مطلق خبر نہیں تھی۔

☆======☆======☆

میں واپس ہوٹل پہنچا تو ماحول کچھ بدلا نظر آیا۔ سب سے پہلے چھوٹے تایا سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ انہوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا اور قریب کھڑے ندیم سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ پھر میری نظر [illegible] پر پڑی۔ وہ ایک دم آگ بگولہ نظر آرہا تھا۔ یہاں تک کہ عینی بھی مجھے گم صم نظر آئی۔ اس دوران میں بڑے تایا' پھنکارتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ میری طرف آرہے تھے۔ یقیناً مجھ سے ہی کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن راستے میں ہی اخلاق نے انہیں روک لیا۔ اس نے بڑے تایا کو باقاعدہ اپنے بازوؤں میں لیا اور ان کے کان میں سرگوشیاں کرتا ہوا واپس انہیں کمرے میں لے گیا۔ ہر نگاہ مجھ پر لگی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ چند لمحے تک کمرے میں بڑے تایا چھوٹے تایا اور اخلاق کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ دونوں تایا سخت غصے میں تھے اور اخلاق غالباً انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ خیال آیا کہ کہیں نیچے درختوں میں میرا فرحین کے ساتھ بیٹھنا ہی تو اس گرما گرمی کا باعث نہیں ہے؟ لیکن یہ خیال دل کو کچھ لگا نہیں۔ میں نے قریب کھڑے ندیم سے پوچھا "آخر ہوا کیا ہے بھئی؟"

ندیم کوئی جواب دیئے بغیر کمرے کی [illegible] چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ صورت حال میری توقع سے زیادہ سنگین ہے۔ اسی دوران میں اخلاق کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ہوٹل سے باہر پارکنگ میں آگیا۔

"یار' آخر بات کیا ہے؟" میں نے اخلاق سے پوچھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "تم کہاں سے آرہے ہو؟"

"ذرا چہل قدمی کے لئے نکل گیا تھا.......... وہاں درختوں میں بیٹھا تھا۔" میں نے میدان کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔

"کب سے وہاں بیٹھے تھے؟"

"قریباً ایک گھنٹے سے۔ تم نے اور نرگس نے خود مجھے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تمہارے پاس سے تو گزر کر گیا تھا.......... لیکن.......... لیکن تم یوں تھانے داروں کی طرح مجھ سے سوال کیوں کر رہے ہو؟"

"یہاں ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔" اخلاق نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کسی نے فوزیہ کے ساتھ سخت بدتمیزی کی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟" میری حیرت عروج پر پہنچ گئی۔

"جہاں میں اور نرگس بیٹھے باتیں کر رہے تھے' وہاں پاس ہی فوزیہ بھی درختوں میں بیٹھی تھی۔ اندھیرے میں کوئی اس پر جھپٹا اور کھینچ کر نیچے کھائی میں لے جانے کی کوشش کی۔ اس نے فوزیہ کی چیخ وپکار روکنے کے لئے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔ فوزیہ نے خود کو چھڑا کر شور مچا دیا۔ گھبرا کر اس نے فوزیہ کو دھکا دیا اور بھاگ گیا۔ یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔"

میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اخلاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تمہیں شبہ ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے؟"

"میں ہرگز ایسا نہیں سوچ سکتا لیکن.......... لیکن فوزیہ.......... میرا مطلب ہے کہ فوزیہ.........."

"یعنی فوزیہ میرا نام لے رہی ہے؟"

اخلاق مجھ سے نظر چرا کر درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔

میرے بدن میں جوالا مکھی دہکنے لگا تھا۔ مجھے کسی ایسے حادثے کا اندیشہ بہت پہلے سے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اخلاق کے ساتھ اس گروپ میں شامل ہونے سے انکار کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری موجودگی جہاں ان لوگوں کی تفریح برباد کرے گی' وہاں میرے

بہت سے زخموں کو بھی تازہ کردے گی۔

میں نے اخلاق کے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تم بھی فوزیہ کے بیان کو درست سمجھ رہے ہو۔ اگر ایسی بات ہے دوست تو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں ہی اس لائق......... بہتر یہی ہے کہ مجھے سیدھا سیدھا پولیس کے حوالے کردو یا پھر خود سارے مل کر میری ہڈی پسلیاں توڑ دو۔"

اخلاق نے بے قرار ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ کیسی باتیں کرتے ہو تیمور!"

"مجھے ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔

اتنے میں ندیم بھی ستے ہوئے چہرے کے ساتھ وہاں آگیا۔ وہ بلا تمہید بولا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا اخلاق بھائی کہ فوزیہ وہاں اندھیرے میں کر کیا رہی تھی؟"

اخلاق چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ "شرارت کر رہی تھی اور کیا کر رہی تھی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" ندیم نے کہا۔

"میں اور نرگس وہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے' وہ شرارت کے موڈ میں تھی۔ چھپتی ہوئی درختوں میں چلی گئی تاکہ ہماری باتیں سن سکے۔"

"وہاں پر گہری تاریکی ہے۔ فوزیہ نے کیسے دیکھ لیا کہ اس سے ہاتھا پائی کرنے والا کون ہے؟" ندیم نے نکتہ اٹھایا۔

"یہی بات میرے ذہن میں بھی آتی ہے......... لیکن وہ بڑے یقین سے........."

ایک بار پھر اخلاق نے میری دل آزاری کے خیال سے فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ خوف سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ الٹی سیدھی ہانک رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں ہوں ہی اسی قابل کہ مجھ پر اس قسم کا گھٹیا الزام لگایا جاتا۔"

میری آنکھیں بے اختیار ڈبڈبا گئی تھیں۔

اخلاق نے میرا شانہ تھامنا چاہا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میرا یہ خیال ہے کہ مجھے اب یہاں سے روانہ ہونا چاہئے۔" میں نے کہا اور تیزی سے ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں نے اپنا سامان پیک کیا اور پندرہ بیس منٹ کے اندر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں ہوٹل چھوڑنے کے لئے کمرے سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اخلاق اور

ندیم کمرے میں آدھمکے۔ اخلاق نے میرے کندھے سے زبردستی بیگ اتار لیا اور بولا۔ "تم کہیں نہیں جاؤ گے' اگر تم جاؤ گے تو پھر ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ جائیں گے اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد بڑے ماموں کے ساتھ اپنے تعلقات پر مجھے نظرثانی کرنا ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "تم اس معاملے کو طول دینے کی کوشش نہ کرو۔ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ مجھے ایک بار پھر اپنی اوقات کا پتا چل گیا ہے۔"

اخلاق اور ندیم اصرار کرتے رہے' میں انکار کرتا رہا۔ بات نے جب بہت طول کھینچا تو اخلاق ایک دم آزردہ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے تیمور! تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ میرا کوئی زور نہیں ہے تم پر......... لیکن اگر تم نے جانا ہی ہے تو صرف ایک دن کے لئے رک جاؤ۔ میں تمہیں یوں ملزم کی حیثیت سے نہیں جانے دوں گا۔ میں ہر صورت میں کل تک کھوج لگاؤں گا کہ فوزیہ سے دست درازی کرنے والا کون تھا۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب لڑکی خود میرے خلاف گواہی دے رہی ہے تو پھر اور کس کی گواہی معتبر ہوگی۔"

"لڑکی کی بات چھوڑو۔ وہ تو اپنے حواس میں نہیں۔ تم بس مجھے ایک دن کی مہلت دے دو۔"

ندیم بولا۔ "ویسے بھی موسم بے حد خراب ہو رہا ہے۔ بوندا باندی بھی شروع ہوگئی ہے' اس وقت آپ کا نکلنا کسی طور مناسب نہیں۔"

ندیم اور اخلاق نے کسی نہ کسی طرح مجھے روک لیا۔ احتیاط کے طور پر جاتے ہوئے وہ باہر سے دروازہ بند کر گئے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' اخلاق اور ندیم اگلے روز دوپہر تک سرگرمی سے اس کھوج میں لگے رہے تھے کہ اندھیرے میں فوزیہ سے بدسلوکی کرنے والا کون تھا؟ لیکن وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ گروپ میں تو میرے سوا بھی شریف زادے تھے۔ ہوٹل کے ملازمین اور ویٹر وغیرہ کو بھی شامل تفتیش کیا گیا مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ فوزیہ نے بدحواسی کے عالم میں میرے خلاف بیان تو داغ دیا تھا لیکن وہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں دے پائی تھی۔ فوزیہ کے بقول اس نے حملہ آور کا منہ نوچا تھا اور

تھپڑ وغیرہ مارے تھے۔ منہ نوچا جائے تو اکثر چہرے پر ناخنوں کے نشانات رہ جاتے ہیں۔ ایسے نشانات کسی کے چہرے پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ میرے چہرے پر بھی نہیں تھے حالانکہ "اعلان شدہ" ملزم میں ہی تھا۔

دوپہر کو چھوٹے تایا اور تائی جان میرے پاس آئے۔ اخلاق بھی ان کے ساتھ تھا۔ چھوٹے تایا نے معذرت کا رویہ اختیار کیا' کہنے لگے۔ "بھائی صاحب کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے نہیں لیکن کیا کیا جائے' بزرگ ہیں۔ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ویسے دل میں غصہ نہیں رکھتے' ابھی آگ بگولا ہوتے ہیں' ابھی نارمل ہو جاتے ہیں۔ اب صبح سے خاموش بیٹھے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تیمور پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچتا ہو گا؟"

تائی بھی چکنی چپڑی باتیں کرنے لگیں۔ میں جانتا تھا' جو کچھ ان کی زبان پر ہے وہ دل میں نہیں ہے۔ ہونے والے داماد کی خاطر انہوں نے اپنے غیظ و غضب کو وقتی طور پر پس منظر میں دھکیل کر میری اشک شوئی کی کوشش کی تھی۔

سہ پہر کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے ایک بار پھر شوگران میں ہی رکنے پر مجبور کر دیا۔ میں اور اخلاق کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ تنویر بھاگا بھاگا آیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا' وہ بولا۔ "ایک بری خبر ہے اخلاق بھائی! جھیل سیف الملوک والے لڑکوں کا گروپ بھی شوگران آ گیا ہے۔ میں نے ابھی ابھی انہیں نئے ہوٹل کے پاس جیپوں سے اترتے دیکھا ہے۔"

"اوہ' مائی گاڈ!" اخلاق کے منہ سے نکلا اور اس کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔

"ان لوگوں نے بھی تمہیں دیکھا ہے۔" اخلاق نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ دیکھا ہے۔" تنویر نے جواب دیا۔

"اب کیا' کیا جائے؟" اخلاق نے مجھ سے پوچھا۔

"اس کا فیصلہ تو وقت ہی کر سکتا ہے۔"

اخلاق چاہتا تھا کہ گروپ کے باقی ارکان سے یہ اطلاع چھپا کر رکھی جائے لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں تھا۔ شوگران چھوٹا سا ہل اسٹیشن ہے۔ وہاں بیس بائیس لڑکوں کا گروپ چھپا کیسے رہ سکتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں یہ خبر ہماری پارٹی کے سبھی ارکان کو معلوم ہو چکی

تھی کہ جھیل والے لڑکے یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ اب دو صورتیں ہو سکتی تھیں' ایک تو یہ لڑکے اتفاقاً یہاں پہنچے تھے' دوسرے انہوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ دونوں صورتوں میں ہمارے لئے بدمزگی کا سامان بہرحال موجود تھا۔ اخلاق وغیرہ شوگران سے آگے سری پائے نامی مقام پر جانا چاہتے تھے اور وہاں کیمپنگ کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اب سب کچھ چوپٹ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

لڑکوں نے شام تک ہمارے ٹھکانے کا کھوج بھی لگا لیا۔ وہ دو تین بار ٹولیوں کی صورت میں شور شرابا کرتے ہوٹل کے سامنے سے گزرے۔ ان میں دو تین نئے چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ لوگ بعد میں ان کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ یہ نئے چہرے حلیے اور صورت کے اعتبار سے چھٹے ہوئے خوش حال غنڈے نظر آتے تھے' ان میں سے ایک کے پاس موبائل فون بھی تھا۔

شام کے بعد میں اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا کہ فرحین وہاں آئیں۔ انہوں نے دوپٹا سر پر اوڑھ کر کانوں کے پیچھے اڑس رکھا تھا۔ دوپٹے کے اس انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے تک نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکا۔ انہوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا اور جلدی سے بولیں۔ "اسے پڑھ لیجئے گا۔"

خط دینے وہ جس متانت سے آئی تھیں' اسی متانت سے واپس چلی گئیں۔ میں نے خط پڑھا اور پڑھتا چلا گیا' لکھا تھا۔ "تیمور صاحب! مجھے اس بات پر بے حد اذیت پہنچی ہے کہ آپ کو ایک بے ہودہ الزام کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کاش' یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ میں آپ کی بے گناہی کی گواہ ہوں کیونکہ جس وقت فوزیہ والا واقعہ ہوا' آپ میرے ساتھ نیچے درختوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے لیکن میں یہ بات دوسروں کو نہیں بتا سکتی۔ میں نے واپس آ کر کہا تھا کہ بازار سے خریداری کر کے آئی ہوں۔ اگر اب یہ کہوں کہ میں بازار نہیں گئی تھی بلکہ آپ کے ساتھ نیچے درختوں میں بیٹھی تھی تو شکوک پیدا ہوں گے........ اور اس گروپ میں کچھ بے حد شکی مزاج قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اگر میں اس واقعے کے حوالے سے زیادہ پریشان ہوں تو شاید اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں آپ کی صفائی دے سکتی ہوں لیکن خاموش رہنے پر مجبور ہوں۔ بہرحال اگر میں آپ کی بے گناہی کی گواہ نہ بھی ہوتی تو میرا ذہن آپ کے حوالے سے ایسے گھٹیا الزام کو کبھی تسلیم نہ

کرتا۔

میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں اور آخر میں آپ سے ایک گزارش ہے۔
اخلاق بتا رہا تھا کہ آپ واپس جانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ میں آپ پر زور تو نہیں دے سکتی، صرف گزارش کرسکتی ہوں۔ جیسا کہ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے، جھیل والے غنڈے ہمارے پیچھے یہاں بھی آگئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ایسے موقع پر آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں۔ آپ کی موجودگی سے مجھے اور باقی سب کو تحفظ کا احساس رہے گا۔ میں نے اخلاق کو مشورہ دیا ہے اور آپ کو بھی رائے دیتی ہوں کہ سری پائے میں کیمپنگ کا پروگرام ختم کردیں اور واپس چلیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی ایسی بدمزگی پیدا ہوجائے جو ساری تفریح کو غارت کردے.........."

میں کافی دیر خط پکڑے بیٹھا رہا۔ فرحین کی تحریر دیکھتا رہا۔ لفظوں کے دائرے، خطوط.......... سب کچھ فرحین ہی کی طرح دلکش تھا۔ اس خط نے مجھے احساس دلایا کہ فرحین کے دل میں میرے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا ہے۔ یہ پتھر میں جونک لگنے والی بات تھی۔ اس سفر کے آغاز میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ انتہائی سنجیدہ مزاج اور محتاط خاتون مجھ پر اتنا بھروسا کرے گی کہ مجھے ایک نامہ تحریر کرے گی اور اس نامے کی تحریر میں میرے لئے ہمدردی کی خوشبو ہوگی۔ یہ سب واقعات کی کرشمہ کاری تھی۔ فرحین بالکل اتفاقیہ طور پر میری بے گناہی کی گواہ ہوگئی تھیں اور یہ ایسی گواہی تھی جسے وہ دینے کی خواہش رکھتی تھیں مگر دے نہیں سکتی تھیں۔ یہ صورتِ حال میرے لئے تکلیف دہ ہونی چاہئے تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ گواہی کے سلسلے میں فرحین کی مجبوری نے فرحین کے دل میں میری ہمدردی کو ابھارا تھا اور میں اس ہمدردی کے لئے ہر قیمت چکانے کو تیار تھا۔ ان جھیل سی خاموش آنکھوں نے کوئی ایسا جادو کیا تھا مجھ پر کہ دل و دماغ ایک گلابی دھند میں اوجھل ہوتے چلے جارہے تھے۔ اس دھند میں ایک پاگل کردینے والی خوشبو تھی۔ ایک ایسا ریشمی لمس تھا جس کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ فرحین کا خط پڑھنے کے بعد میں نے پھاڑ دیا اور اس کے پرزے آتش دان میں جھونک دیئے۔
اگلے روز بھی اخلاق اور ندیم کے پُر زور اصرار کے باوجود میں نے ناشتا اپنے کمرے

میں ہی کیا۔ میں بڑے تایا کی شکل دیکھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ انہیں دیکھ کر میرا دماغ پھر چیخ جائے گا اور ان کی وہ غصیلی نگاہیں یاد آجائیں گی جو پرسوں شام انہوں نے مجھ پر ڈالی تھیں اور جنہوں نے میرے سینے کو چھید کر رکھ دیا تھا.......... اخلاق، ندیم اور تنویر وغیرہ نے بھی میرے ساتھ ہی ناشتا کیا، ہاں سلجوق نظر نہیں آیا۔ اخلاق کی زبانی علم ہوا کہ بدقماش لڑکوں کی ٹولی کو سبق سکھانے کے لئے بڑے تایا مقامی پولیس چوکی سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے۔ سلجوق بھی ان کا ہمنوا تھا مگر اکثریت نے اس کی مخالفت کی لہٰذا یہ پروگرام کینسل ہوگیا۔ ناشتے کے دوران میں ہم چاروں اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں ایک ایسی بات سامنے آئی جس نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اپنے غم وغصے کو پس منظر میں دھکیل دوں اور فی الحال گروپ کو چھوڑنے کا خیال ترک کردوں.......... دراصل تنویر یہ بات کر رہا تھا کہ غنڈا پارٹی کو یہ کیسے علم ہوا کہ ہم شوگران میں ہیں؟ ندیم نے کہا کہ ممکن ہے کہ جب ہم ناران سے روانہ ہوئے تو گروپ میں سے ایک دو لڑکوں نے ہماری بے خبری میں ہمارا پیچھا کیا ہو، اس کے بعد ساتھیوں کو اطلاع دے دی ہو کہ ہم شوگران میں ہیں۔
میں نے کہا۔ "پھر تو یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا پیچھا کرنے والے ایک دو لڑکے پچھلے دو تین دن سے ہمارے ساتھ ہی شوگران میں موجود ہوں۔"
اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بجلی کی طرح میرے ذہن میں آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ فوزیہ کے ساتھ دست درازی کرنے والے بھی یہی لڑکے ہوں۔
میں نے اپنے خیال کا اظہار اخلاق وغیرہ پر کیا تو وہ بھی بری طرح چونک گئے۔ یہ بات واقعی قابلِ غور تھی۔
میں نے اس پہلو پر جتنا بھی سوچا، میرا یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا کہ گروپ کے کچھ لڑکے یہاں موجود تھے اور فوزیہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے میں غنڈا پارٹی کا عمل دخل ہے۔ بہرحال اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے میرے یا اخلاق وغیرہ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا۔
اگلے چار پانچ روز ہم نے شوگران میں ہی گزارے۔ لڑکے بھی شوگران میں موجود تھے۔ گاہے گاہے وہ ہمیں نظر بھی آتے رہے لیکن ان کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں

ہوئی جو پھر سے جھگڑے کا سبب بنتی۔ وہ اپنے حال میں مگن نظر آ رہے تھے۔ ان کا ہوٹل ہمارے ہوٹل سے کافی فاصلے پر تھا اور شاید یہ بات بھی حالات کی بہتری میں معاون ثابت ہوئی تھی۔

فرحین کے ساتھ ایک دوبار میرا مختصر مکالمہ ہو چکا تھا۔ ان کے لہجے میں اب مجھے اپنے لئے وہ سرد مہری نظر نہیں آتی تھی جو اس سے پہلے نمایاں تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی بہت خوبصورت لگتی تھیں۔ دل چاہتا تھا کہ سب کام چھوڑ کر اور ہر طرف سے دھیان ہٹا کر ان کی مسکراہٹ دیکھتے رہو۔ شاید انہیں بھی اپنی مسکراہٹ کی قدر و قیمت کا علم تھا۔ لہٰذا وہ بہت کم مسکراتی تھیں۔ میں نے کئی بار سوچا کہ یہ مسکراہٹ واقعی اتنی خوبصورت ہے یا شوگران نے اسے خوبصورت بنا دیا ہے۔ ہر بار ذہن سے یہی جواب آیا کہ شوگران نے اس مسکراہٹ کو خوبصورت نہیں بنایا ہوگا' اس مسکراہٹ نے شوگران کو چار چاند لگائے ہیں۔ وہ بڑی فلسفیانہ بات کرتی تھیں۔ میں بات پر جتنا غور کرتا تھا' اس کے نئے نئے معنی نکلتے چلے جاتے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں بڑی تیزی سے فرحین کی شخصیت کے اثر میں آ رہا ہوں۔ میرے دل میں فرحین کے لئے جو جذبہ پیدا ہوا تھا' وہ بے شک بہت خوبصورت تھا لیکن اس کے انجام کا سوچ کر میرا دل ہول جاتا تھا۔ فرحین کے اور میرے درمیان ناقابلِ عبور فاصلے حائل تھے۔ ان میں مزاج اور لائف اسٹائل کا فاصلہ بھی تھا۔ وہ مذہبی ذہن رکھنے والی ایک نہایت اصول پسند اور روایت پسند لڑکی تھی۔ میں مزاج کا رند تھا اور آوارہ گردی رگ رگ میں رچی بسی تھی۔ وہ شرافت کی علمبردار تھیں' میں بعض افراد کے نزدیک بدقماش شمار ہوتا تھا۔ وہ نہایت تعلیم یافتہ تھیں۔ میں نے واجبی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ نرم و نازک پھول جیسی تھیں' میں صحرا میں اگا ہوا ایک پرخار پودا تھا۔ غرض ہر لحاظ سے میرے اور ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ابھی تک ایک ایسے شخص کے نام پر بیٹھی ہوئی تھیں جو برسوں پہلے اسے بھلا کر سات سمندر پار آباد ہو گیا تھا' کبھی اس کی خبر لی تھی نہ اس کا حال جانا تھا لیکن وہ وفا کی پتلی اس کے ماں باپ کے پاس رہ رہی تھی اور شب و روز ان کی خدمت کر رہی تھی۔ اسے اپنی ساری زندگی کی بربادی منظور تھی لیکن طلاق کا داغ ماتھے پر سجانا منظور نہیں تھا۔ میں نے اس موضوع پر سوچنا شروع کیا تو ذہن کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہوٹل کی کھڑکی سے باہر نظر

آنے والے پربتوں کے خوش نما مناظر میری نگاہوں کے سامنے رہے لیکن مجھ سے بہت دور چلے گئے۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری رگوں میں اس خطے کے رسم و رواج اب تک خون بن کر دوڑ رہے ہوں۔ ہندومت کے وہ کہنہ عقائد جن کے مطابق بیوی اپنے شوہر کی میت کے ساتھ ستی ہو جایا کرتی تھی.......... وہ اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی زندگی کے سوا کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی...........

میں نے سوچا کہیں ہماری کچھ مشرقی عورتوں میں یہ حد سے تجاوز کر جانے والی شوہر پرستی بھی اس "ستی" کی کوئی بدلی ہوئی شکل تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے خون میں نسل در نسل سفر کرنے والے فرسودہ عقائد ابھی تک ہمارے اسلام کی تعلیمات کے خلاف مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کیوں ابھی تک کچھ ایسی رسمیں ہم میں باقی ہیں جن کا اسلام میں دور دور تک ذکر نہیں.......... ہمارا مذہب کسی جگہ یہ حکم نہیں دیتا کہ اگر ایک معصوم لڑکی کسی غلطی کے سبب ایک شرابی' جواری اور آوارہ شوہر کے پلے بندھ جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ساری عمر شوہر کے ظلم سہتی رہے اور اپنے چھٹکارے کے بارے میں سوچنا گناہِ کبیرہ سمجھے۔

پھر میرے خیالات کا دھارا فرحین کی طرف مڑ گیا۔ وہ خوبصورت تھیں' جوان تھیں۔ کیوں اپنے لئے کوئی جیون ساتھی نہیں چاہتی تھیں۔ کوئی ہم مزاج' ہم خیال' پڑھا لکھا شریف زادہ ان کی زندگی میں آ سکتا تھا اور ان کی خزاں کو بہار میں بدل سکتا تھا۔

پھر میرا دھیان عینی کی طرف چلا گیا۔ فرحین کی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی تھی کہ عینی ایک جذباتی لڑکی ہے اور اس میں لاابالی پن بہت زیادہ ہے۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ میرے ساتھ اس کے لگاؤ میں سطحیت ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ جیسے اس نے وقت گزاری کے لئے مجھ سے بے تکلفی اختیار کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے فلرٹ بھی کہا جا سکتا تھا۔ مجھے کاغان کی وہ رات ابھی بھولی نہیں تھی جب عینی نے مجھ سے اپنی دلچسپی کے اظہار کے لئے ایک نہایت عامیانہ طریقہ اختیار کیا تھا اور میرے بستر تک اپنا ہاتھ پہنچا دیا تھا۔ یہ واقعہ عینی کے کھلے ڈلے رہن سہن کا عکاس تھا۔ تنویر کی زبانی بھی مجھے ایک دن معلوم ہوا تھا کہ کالج میں اور خاندان میں عینی کے ایک دو افیئرز مشہور ہوئے ہیں۔ یہی وجوہات تھیں کہ میں اب عینی سے حتی الامکان کنی کترا رہا تھا۔ در حقیقت مجھے

کبھی بھی عینی میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ نہ ہی میں نے عینی کی خواہش کے باوجود اسے کبھی چھونے کی کوشش کی تھی۔ اگر دوران سفر میں نے عینی کی بے تکلفی کا جواب بے تکلفی سے دیا بھی تھا تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ میں غیرارادی طور پر فرحین کی توجہ چاہ رہا تھا۔

فوزیہ والے واقعے کے بعد ایک شام عینی میرے پاس آئی تو میں نے اس سے واضح بے رخی اختیار کی۔ میں نے کہا۔ ”تم نے دیکھ ہی لیا ہے عینی کہ تمہارے خاندان میں میری کتنی عزت ہے۔ اب اس عزت میں اضافہ مت کرو۔ بس اتنا ہی احترام و وقار مجھے ہضم ہوجائے تو بہت ہے۔“

وہ مجھے گھورتی رہی تھی لیکن بولی کچھ نہیں تھی‘ پھر پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔

شوگران میں ہمارے قیام کا آٹھواں دن تھا۔ شام کو فاریسٹ ریسٹ ہاؤس کے خوبصورت گراسی گراؤنڈ میں ٹہلتے ٹہلتے فرحین میرے پاس آگئیں‘ کہنے لگیں۔ ”کیا بات ہے‘ عینی آپ سے بہت کھنچی کھنچی ہے‘ کچھ کہا ہے آپ نے اسے؟“

میں نے کہا۔ ”سارے ہی مجھ سے کھنچے کھنچے ہیں۔ میں نے کسی سے کیا کہا ہے؟“

”کوئی کھنچا کھنچا نہیں‘ آپ ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔“

”کوئی بات ہو تو محسوس کی جاتی ہے اور میں تو ہوں ہی سراپا شر اور فساد۔ اگر میرے اور آپ لوگوں کے بیچ میں اخلاق نہ ہوتا تو شاید اب تک مجھے یہاں سے دھکے دے کر نکال دیا گیا ہوتا یا پھر پولیس کے حوالے کردیا گیا ہوتا۔“

”میں مانتی ہوں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ جس وقت فوزیہ والا واقعہ ہوا‘ آپ بغیر اطلاع کے اپنے کمرے سے نکلے ہوئے تھے۔ فوزیہ سے کھینچا تانی کرنے والے کا لباس بھی اتفاقاً وہی تھا جو آپ نے پہن رکھا تھا۔ بدحواسی میں فوزیہ کے منہ سے آپ کا نام نکل گیا۔ وہ خود بھی اس بات پر پشیمان ہے۔ ابا جان ”بڑے تایا“ سمیت سب کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آپ سے معذرت کرنے بھی آئیں۔“

”یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں فرحین صاحبہ! آپ نہیں جانتیں ان لوگوں کے دل

میں میرے لئے نفرت کی کتنی ریل پیل ہے۔ ان کے چہروں کی مسکراہٹیں مصنوعی اور ان کے میٹھے بول دراصل زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں۔“

فرحین نے غور سے مجھے دیکھا پھر بولیں۔ ”کچھ بھی ہے‘ میں کم از کم عینی کے حوالے سے تو یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ وہ فوزیہ والے واقعے میں آپ کو قصور وار سمجھتی ہے اور اسی سبب آپ سے کھنچی کھنچی ہے۔“

”پھر آپ کیا سمجھتی ہیں؟ اس کے علاوہ اور کیا بات ہوسکتی ہے؟“

فرحین کی آنکھوں میں میرے لئے تشکر کی ایک کرن نظر آئی۔ وہ آہستگی سے بولی ”میرا خیال ہے کہ آپ نے اسے خود سے دور رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ سرد مہری برتی ہے اس سے۔“

”آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔“ میں نے کہا۔

سامنے سے ندیم اور اخلاق ٹہلتے آرہے تھے۔ فرحین کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔ اخلاق اور ندیم نے بڑے احترام سے فرحین کو سلام کیا۔ ان کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ شاید انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ فرحین صاحبہ جو ہر وقت چہرے پر گہری سنجیدگی سجائے امورِ خانہ داری میں مصروف نظر آتی ہیں‘ پھولوں کے درمیان چہل قدمی کررہی ہیں اور میرے ساتھ مصروفِ گفتگو ہیں۔

”اتنا حیران کیوں ہورہے ہو؟“ فرحین نے اخلاق سے پوچھا۔

”حیران کہاں‘ میں تو پریشان ہوں بھابی.......... آپ کو مسکراتے ہوئے دیکھا ہے تو لگا ہے کہ قربِ قیامت کی نشانیاں ظاہر ہورہی ہیں۔“

”کیا اتنی خوفناک مسکراہٹ ہے میری؟“

”مسکراہٹ تو پیاری ہے لیکن اس کا نتیجہ ضرور خوفناک نکلے گا.......... یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بہت خوبصورت نتیجہ نکل آئے۔“

”لیکن نتیجہ نکلنا کیوں لازمی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔ ”تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ دنیا میں جب بھی کوئی اہم واقعہ ہوا وہ یا تو کسی اہم واقعے کا نتیجہ یا اہم واقعے کا سبب تھا۔“

”اخلاق! میرا خیال ہے کہ تم میری مسکراہٹ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے

رہے ہو؟" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

ان کی سنجیدگی میں کچھ ایسا وقار تھا کہ بندے کا دل............ خواہ مخواہ مئودب ہونے کو چاہنے لگتا تھا۔

☆======☆======☆

شوگران میں قیام کے دوران میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور ہمارا یہ اندیشہ غلط نکلا کہ بگڑے ہوئے رئیس زادوں کی ٹولی ہمیں تنگ کرنے کے لئے ہمارے پیچھے آئی ہے۔ نہ جانے کیوں اب میرا اپنا دل بھی اخلاق' فرحین' ندیم اور گروپ کے دیگر افراد سے الگ ہونے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اب اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے فرحین کی آنکھوں میں کہیں بہت گہرائی میں کوئی ایسی بات نظر آگئی تھی جس نے زنجیر بن کر پاؤں جکڑ لئے تھے اور میرے قدموں سے لپٹے ہوئے بگولے جیسے منجمد ہوگئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ گروپ کے بیشتر ارکان مجھ سے نالاں ہیں اور دل ہی دل میں مجھے شب وروز لعن طعن کررہے ہیں' میں حقائق سے نظریں چرا رہا تھا اور اپنے اندر کی خود داری کو کسی کی حسین آنکھوں کی خاطر کچل رہا تھا اور ایسا میری زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ کوئی یوں میرے دل و دماغ میں سمایا تھا اور میرے رگ و پے میں گہرائی تک سرایت کرگیا تھا۔

فرحین نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا' نہ میں نے ان سے کچھ کہا تھا' نہ کوئی ایسا واقعہ ہوا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ میرے بارے میں کسی خاص انداز سے سوچ رہی ہیں پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی' میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز آرہی تھی کہ میں فرحین کو چاہتا ہوں اور اب سے نہیں' بہت مدت سے چاہتا ہوں۔ جیسے میرے اندر فرحین کے لئے بہت پہلے سے ایک خلا موجود تھا اور دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بھی آرہی تھی کہ مستقبل قریب میں کوئی ایسا لمحہ بھی آئے گا جب میں فرحین کو اپنے قریب پاؤں گا۔ بے شک فی الوقت اس لمحے کا تصور محال تھا لیکن کوئی وجدانی لہجے میں میرے اندر بولتا تھا اور مجھے مجبور کررہا تھا کہ میں فرحین کے آس پاس رہوں' اپنے اندر ایک امید کو پروان چڑھاؤں اور اس امید کی شاخ پر کھلنے والے ان گنت ارمانوں کی پرورش کروں۔

جو کچھ ہو رہا تھا' بڑی تیزی سے ہو رہا تھا مگر مجھے اچھا لگ رہا تھا............ چند روز کے اندر ہی میں بیمار بھی ہوا' عینی کے ساتھ بے تکلف بھی ہوا' انہی گنے چنے دنوں میں مجھے ایک گھٹیا الزام کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ عینی کی مجھ سے دوری بھی ہوئی اور فرحین کی آنکھوں میں مجھے وہ انوکھی کرن بھی نظر آئی جسے میں فی الحال کوئی نام نہیں دے سکتا تھا لیکن جس نے میری روح میں اتر کر میری زیست کے خاموش تاروں کو جھنجوڑ دیا تھا۔

شوگران کے دلکش نشیب و فراز میں گھومتے ہوئے' برف پوش پہاڑوں سے بہت اوپر نیلے آسمان کو تکتے ہوئے اور قراقرم کی بلندیوں کو چھو کر آنے والی عطر بیزا ہوا کو سینے میں بھرتے ہوئے' میں نے بیسیوں بار سوچا کہ اگر میرے اور فرحین کے درمیان کوئی تعلق پیدا ہوا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ میری والدہ کے حوالے سے اس خاندان میں جو تعصب اور نفرت موجود تھی' میں اس سے پوری طرح آگاہ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ فرحین کے ساتھ میرے کسی تعلق کو بھی اسی پس منظر میں دیکھا جائے گا اور مجھے شدت سے مطعون کیا جائے گا مگر پھر میں سوچتا کہ فرحین کی نسبت سے جو کچھ بھی میرے دل میں ہے' سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے پھر اسے کیوں چھپایا جائے۔ کسی وقت مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میری والدہ نے جو الفاظ لکھے تھے اور کہے تھے وہ جگنوؤں کی طرح میرے آس پاس ہیں اور ایک تاریک راستے پر میری رہنمائی کررہے ہیں۔

آخر ایک روز ہم شوگران سے سری پائے کے لئے روانہ ہوگئے۔ ہمیں اپنی گاڑیاں شوگران میں چھوڑنا پڑی تھیں کیونکہ آگے راستہ بہت خراب تھا۔ قریباً ویسا ہی راستہ تھا جو ہمیں ناران سے جھیل سیف الملوک لے کر گیا تھا اور جسے ہم نے پل صراط کا نام دیا تھا۔ جھیل سیف الملوک اور سری پائے کے راستے اتنے خطرناک ہیں کہ انہیں نیکی و رشد وہدایت کے راستے کہنا چاہئے۔ بڑے بڑے دہریے قسم کے لوگوں کو میں نے ان راستوں پر سفر کے دوران میں باقاعدہ قرآنی آیات پڑھتے دیکھا ہے اور گناہوں سے توبہ تلا کرتے سنا ہے۔ شوگران سے سری پائے کا راستہ بھی قریباً سات کلومیٹر ہے۔ یہ کچا راستہ پتھروں سے اٹا ہوا ہے۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف جان لیوا کھائیاں منہ کھولے کھڑی ہیں۔ جیپیں اچھلتی کودتی اور دھاڑتی ہوئی اس راستے کو یوں طے کرتی ہیں جیسے انہیں خود بھی اس سفر سے چھٹکارا پانے کی جلدی ہو۔ سری اور پائے کے درمیان ڈیڑھ دو کلومیٹر کا فاصلہ ہے

لیکن اکثر لوگ اسے ایک ہی علاقے کے طور پر لیتے ہیں اور سری پائے ہی بولتے ہیں۔

صبح نو بجے روانہ ہو کر ہم قریباً گیارہ بجے سری پائے پہنچ گئے۔ پائے کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ بس آٹھ دس مکانات کے چند ایک مجموعے ہیں۔ سبزہ بہت زیادہ ہے۔ بلندی کی وجہ سے اکثر یہاں دھند چھائی رہتی ہے۔

ایک نہایت سرسبز پہاڑی کے دامن میں ہم نے اپنے کیمپ لگا لئے۔ ہم سے قریباً ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی آبادی موجود تھی۔ خوش اخلاق لیکن محتاط لوگ تھے۔ ان کی بکریاں اور مویشی وغیرہ ہمارے خیموں کے اردگرد گھاس پر منہ مار رہے تھے۔ آبادی کے بچے اپنی خوبصورت آنکھوں میں حیرت اور پیاری سی شوخی چھپائے ہمارے اردگرد اکٹھے ہوگئے اور ہماری مصروفیات دیکھنے لگے' جب ہم نے اپنے کیمرے ان کی طرف سیدھے کئے تو چند بہت چھوٹی عمر کے بچوں کے سوا سب چیختے چلاتے بھاگ گئے اور پھر کافی فاصلے پر کھڑے ہو کر ہمیں شوخ نظروں سے دیکھنے لگے۔ غالباً بڑوں نے انہیں تصویر وغیرہ کھنچوانے سے منع کر رکھا تھا۔ تصویر کھنچوانے سے اس قسم کا احتراز دور دراز علاقوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ شمالی علاقوں کے دور دراز علاقوں میں میرے ساتھ اکثر فوٹوگرافی کے حوالے سے دلچسپ واقعات پیش آئے ہیں۔ میں اخلاق اور تنویر کو ایک ایسا ہی واقعہ سنانے لگا۔ "ایک مرتبہ نانگا پربت کے بیس کیمپ کے راستے میں ایک دور افتادہ بستی سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نوجوان لڑکے کی تصویر کھینچ لی۔ لڑکا رونے لگا اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اسی دوران میں قریبی کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اس کے گاؤں والے بھی آ گئے۔ وہ سب شنا زبان بولتے تھے لیکن ان میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم نے تصویر کھینچ کر زبردست غلطی کی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ تصویر کھنچوانے سے جسم کی اندرونی طاقت جسم سے خارج ہو کر تصویر میں چلی جاتی ہے اور تصویر اتروانے والا بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب اگر یہ لڑکا بیمار ہوگیا تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر گاؤں کے ایک گھر میں بند کر دیا اور لڑکے کے بیمار پڑنے کا انتظار کرنے لگے۔"

تنویر نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟ لڑکا بیمار ہوا؟"

"ہاں......... دوسرے روز شام تک وہ سچ مچ بیمار ہوگیا۔ اسے تیز بخار تھا اور وہ

ہذیان بولتا تھا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اپنی نظربندی کی تیسری رات میں وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلا۔"

میری باتوں کے دوران میں ہی فرحین بھی وہاں آ بیٹھی تھیں اور دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ میں خاموش ہوا تو وہ بولیں۔ "اس کہانی میں مجھے صرف ایک بات غیر یقینی محسوس ہوئی ہے......... اور وہ یہ کہ جس کی تصویر آپ نے کھینچی' وہ چیخا چلایا نہیں ہوگا بلکہ وہ "چیخی چلائی" ہوگی۔ میں نے سیاح حضرات کو اکثر و بیشتر تصویریں کھینچتے دیکھا ہے۔ ان میں شاید ہی کسی نے نوجوان لڑکے کی تصویر کھینچی ہو۔"

ایک زور دار قہقہہ پڑا۔ کچھ تو بات بھی ہنسی کی تھی' کچھ یہ فرحین کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔ وہ تو اتنی سنجیدہ تھیں کہ مسکرا کر کوئی عام بات بھی کرتیں تھیں تو لگتا تھا کہ ہلال عید نظر آنے کی خوشخبری سنا رہی ہیں۔ اب انہوں نے ہلکی پھلکی بات کی تھی تو سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

میں نے کہا۔ "وہ تصویر تو واقعی لڑکے کی تھی لیکن اب جی چاہ رہا تھا کہ ایک لڑکی کی تصویر بھی کھینچوں۔ وہ ہنستے ہوئے اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔"

"کہیں آپ کا گستاخانہ اشارہ فرحین باجی کی طرف تو نہیں؟" ندیم نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"اس میں گستاخی والی تو کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی جھوٹ ہے۔ فرحین صاحبہ کی مسکراہٹ سب کو اچھی لگ رہی ہے......... دراصل وہ کبھی کبھی مسکراتی ہیں نا۔"

فرحین بولیں۔ "اگر مسکراہٹ کی پسندیدگی کا یہی راز ہے تو پھر میں اگلی بار تین چار سال بعد ہی مسکراؤں گی۔"

سب حیرت سے فرحین کو دیکھ رہے تھے۔ شاید ان میں سے کسی کو توقع نہیں تھی کہ فرحین میری ہلکی پھلکی بات کا جواب ہلکے پھلکے انداز میں دیں گی۔ وہ واقعی بہت بدلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لباس بھی کچھ نکھرا نکھرا تھا۔ بال سلیقے سے چوٹی کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور چوٹی کمر پر نیچے تک لہرا رہی تھی۔ چہرہ ہمیشہ کی طرح میک اپ سے عاری تھا لیکن آج ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا کیونکہ اس پر رقم سنجیدگی کو خوش مزاجی کی ایک لہر

نے دھوڑالا تھا۔ وہ سب نوجوان جو فرحین کی موجودگی میں سہمے سہمے رہتے تھے' آج خود کو ایزی محسوس کر رہے تھے۔ نوک جھوک جاری تھی اور کبھی کبھی کوئی چٹکلا بھی سنائی دے جاتا تھا۔

اس دوران نماز عصر کا وقت ہوگیا۔ فرحین صاحبہ نے اعلان کیا کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے لہٰذا سب اٹھ جائیں۔ حکم کی دیر تھی کہ سب اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔ جنہوں نے نماز پڑھنی تھی وہ وضو کرنے کے لئے چشمے کی طرف چلے گئے' جنہوں نے راہِ فرار اختیار کرنی تھی وہ میری طرح کان لپیٹ کر دائیں بائیں ہوگئے.......... سری پائے میں گھومتے گھومتے مجھے ایک بار پھر شوگران یاد آنے لگا۔ شوگران کی دو خصوصیات یادگار تھیں۔ ایک تو وہ کچے پکے سیب جو پہاڑی ڈھلوانوں پر بافراط ملتے تھے اور جنہیں لڑکیوں نے خوب آنکھیں میچ میچ کر اور چٹخارے لے لے کر کھایا۔ دوسرا وہ چھپر ہوٹل جس میں ہم نے فائیو اسٹار ہوٹل کا سا مزہ پایا۔ اس ہوٹل کا نام غالباً ڈرائیور ہوٹل تھا۔ معمولی ہونے کے باوجود یہ بہت صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ مالک خوش اخلاق' ماحول خوشگوار اور کھانے خوش ذائقہ تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بل بھی خوش کن ہوتا تھا۔ جس طرح کھانا کھا کر معدے پر بوجھ نہیں پڑتا تھا' بل ادا کر کے جیب پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ہی ایک احاطے میں بہت سی خوشنما مرغیاں گھوم پھر رہی تھیں۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ کر مرغیوں کا چال چلن ملاحظہ کرتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے پانچ چھ ہونہار مرغیاں منتخب کر کے ان کا کڑاہی گوشت بنوا لیتے۔ ہزاروں فٹ گہری کھائیوں کے کنارے کھلے آسمان تلے بیٹھ کر کیے گئے وہ لنچ اور ڈنر یادگار تھے.......... اب یہاں سری پائے میں بھی دو چیزیں ناقابلِ فراموش تھیں۔ ایک تو وہ خوش نما بادل جو ہمہ وقت ہمارے اردگرد سفید دھند کی شکل چھائے رہتے اور ماحول کو خوابناک بناتے تھے' دوسرے وہ سبزہ جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کائنات کے اس کنارے سے لے کر آخری کنارے تک ہر طرف ہرا ہی ہرا ہے۔

ہمارے جدید طرز کے خیمے ہر قسم کے موسمی حالات کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ یہ خیمے بارش آندھی اور سخت سردی میں بھی گھر جیسا آرام مہیا کرتے ہیں۔ ان کی شکل الٹے پیالے جیسی ہوتی ہے۔ ان کے اندر کھڑا تو نہیں ہوا جاسکتا تاہم سیدھا ہو کر بہ آسانی بیٹھا

جاسکتا ہے۔ ہم نے کل سات خیمے لگائے تھے' بعض خیموں میں دو اور بعض میں تین یا چار افراد سو سکتے تھے۔

سری پائے کے ماحول نے ہمیں اپنا اسیر کرلیا اور ہم سب کچھ بھول بھال کر اس "حسنِ خداداد" میں محو ہوگئے۔ دوسرے روز دوپہر کو دھوپ نکلی تو قرب وجوار کے وسیع مناظر نگاہ کو دعوتِ پرواز دینے لگے.......... ہمیں اپنے چاروں طرف نہایت حسین چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ ہر کوئی دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کون سی چوٹی ہے۔ سلجوق کو اس معاملے میں ایکسپرٹ سمجھا جارہا تھا۔ وہ بھی بحیثیت پارٹی لیڈر کے الٹی سیدھی ہانک رہا تھا۔ ایک دو چوٹیوں کے بارے میں اس نے صحیح بتایا' باقی کے بارے میں یونہی جھوٹ سچ سنا دیا۔

اخلاق نے مجھ سے کہا۔ "یار تیمور! تم ہی کچھ روشنی ڈالو۔ یہ فردوسِ بریں کے پہاڑ ہیں یا ان کا تعلق ہماری اس فانی دنیا سے ہی ہے۔"

میں نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ وہی ملکہ پربت ہے جو ہم نے جھیل سیف الملوک پر دیکھی تھی' یہ اس کی دوسری سائڈ ہے اور یہ دائیں جانب جو چوٹی نظر آرہی ہے' اسے مکڑا پیک کہا جاتا ہے۔ مکڑا پیک کیوں کہا جاتا ہے یہ آپ خود دیکھ لیں۔ چوٹی پر سے برف پگھلتی ہے تو وہ دودھیا لائنوں کی شکل میں چاروں طرف ڈھلک جاتی ہے۔ آپ غور سے دیکھیں تو یہی لگے گا جیسے مکڑے کی ٹانگیں ہیں۔"

"واہ.......... واہ سبحان اللہ" اخلاق اور ندیم پکار اٹھے "اب تو یہ واقعی مکڑا چوٹی نظر آنے لگی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہمارے عقب میں سیرول پیک ہے اور یہ بائیں طرف موسیٰ کا مصلیٰ ہے۔"

"موسیٰ کا مصلیٰ؟" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

"جی ہاں۔ اس چوٹی کو موسیٰ کا مصلیٰ کہا جاتا ہے۔"

سلجوق اصرار کرنے لگا کہ موسیٰ کا مصلیٰ یہ نہیں بلکہ ملکہ پربت کے ساتھ والی چوٹی کو موسیٰ کا مصلیٰ کہا جاتا ہے۔ وہ مکڑا پیک کو بھی کوئی دوسرا نام دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر میرے اور سلجوق کے درمیان اس معاملے پر بحث ہوئی۔ بحث جب باقاعدہ تکرار کی شکل

اختیار کرنے لگی تو چھوٹے تایا نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "چلو جو بھی نام ہیں' لیکن چوٹیاں بہرحال اچھی ہیں۔ باقی جس چوٹی کو تم مکڑا پیک کہہ رہے ہو' وہ مجھے مکڑا پیک نظر آرہی ہے اور نہ چھکڑا پیک' مجھے تو لگتا ہے کہ چاکلیٹ رنگ کی کون آئس کریم پر ونیلا کی سفید دھاریاں ہیں۔ اس لحاظ سے اس پیک کا نام لذیذہ پیک ہونا چاہئے۔"

"بس آپ کو تو کھانے کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں آتی۔" چھوٹی تائی نے تایا کو ٹوکا۔

اس پر قہقہہ پڑا۔ خیال تھا کہ بات آئی گئی ہوجائے گی لیکن سلجوق بدستور بس گھول رہا تھا۔ اس نے پھر یہی موضوع چھیڑ دیا۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ موسیٰ کا مصلیٰ دراصل ملکہ پربت کے ساتھ والی چوٹی کو کہا جاتا ہے۔ بحث ایک بار پھر تکرار کی شکل اختیار کرنے لگی تو میں نے خاموشی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔

شام کو میں اور اخلاق آبادی پہنچے۔ ہم نے وہاں سے آٹھ دس مرغیاں اور ایک چھوٹے سائز کا بکرا خریدا۔ آبادی کے لوگ ہمارے ساتھ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ سیاحوں کی آمدورفت سے انہیں کافی فائدہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہم اپنا بچا کھچا سالن یا روٹی وغیرہ اپنے کیمپ کے نزدیک نہ پھینکیں کیونکہ پرندے اور آوارہ جانور اکٹھے ہوجاتے ہیں اور کیمپنگ کرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ یہی بات میں اپنے طور پر بھی گروپ کے افراد سے کہہ چکا تھا۔ اس وقت میری بات پر زیادہ کان نہیں دھرا گیا تھا لیکن اب اخلاق نے بڑے دھیان سے سنا۔ اسی دوران میں ندیم اور فرحین بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ہم کافی دیر تک بستی والوں سے گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ ایک بار پھر اردگرد کی چوٹیوں کی بات چھڑ گئی۔ تنویر کے پوچھنے پر بستی کے ایک عمر رسیدہ شخص نے چوٹیوں کے نام گنوائے۔ سلجوق کی یہ بات غلط ثابت ہوگئی تھی کہ موسیٰ کا مصلیٰ ملکہ پربت کے ساتھ والی چوٹی کو کہا جاتا ہے' اسی طرح مکڑا پیک کے بارے میں بھی اس کے ریمارکس غلط اور میرے درست ثابت ہوئے تھے۔

ندیم کا خیال تھا کہ کیمپ واپس پہنچ کر سلجوق کو شرمندہ کیا جائے لیکن میں نے منع کردیا۔ میں نے کہا۔ "اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ وہ بستی والوں کی معلومات کو بھی ناقص قرار دے دے' ایسے میں ہم کیا کرلیں گے؟ خواہ مخواہ اس کے

چڑچڑے پن میں اضافہ ہوگا۔"

اخلاق بولا۔ "لیکن وہ تو اس معاملے میں پانچ ہزار کی شرط لگانے پر تلا ہوا تھا اور غالباً اب بھی تلا بیٹھا ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر ہم نے پانچ ہزار جیت کر سلجوق کا خوش گوار موڈ کھودیا تو یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔ لہٰذا اس بات کو یہیں ٹھپ کردیتے ہیں۔"

اگلے دو تین روز سب لوگوں نے بہت انجوائے کیا۔ سب ٹولیوں کی شکل میں بٹ جاتے' کھاتے پیتے' گھومتے پھرتے اور میوزک سنتے۔ ندیم میوزک کا بے حد شوقین تھا۔ وہ ڈرائی سیلز کی ایک پوری پیٹی ساتھ لے کر گیا ہوا تھا۔ جب ڈرائی سیل ختم ہونے کے قریب آگئے تو اس نے خود گانا شروع کردیا اور واقعی اس کی آواز سننے کے لائق تھی...........

عینی بدستور مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ اس نے میری بے رخی کا سخت نوٹس لیا تھا اور دس گنا زیادہ بے رخی دکھا رہی تھی۔ شاید وہ واقعی فلرٹ کررہی تھی۔ اس قسم کے خواتین وحضرات جتنی تیزی سے تعلقات بناتے ہیں' اتنی ہی تیزی سے ختم بھی کرلیتے ہیں۔ وہ عشق پیشہ دیوانوں کی طرح کوئی بات دل سے لگاتے نہیں ہیں...........

میں غیر محسوس طور پر فرحین کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا جارہا تھا۔ یہ ایک ایسی کشش تھی جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ بات محسوس کرکے میرے رگ وپے میں ہزارہا گلستان کھل گئے تھے کہ فرحین کی آنکھوں میں گاہے گاہے مجھے ایک ایسی روشنی نظر آتی تھی جسے میں کم ازکم وابستگی تو کہہ ہی سکتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے لئے وابستگی کا یہ موہوم احساس ہی بہت ہے اور میں اس کے سہارے ساری زندگی گزار سکتا ہوں لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ عملاً ایسا نہیں ہوا کرتا۔ جذبے ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں' وہ کبھی ٹھہرتے نہیں' مثلاً محبت ہی کو لیں' یہ بڑھتی ہے یا پھر گھٹتی ہے........... میری محبت بھی بڑھ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ شاید فرحین کی آنکھوں میں نظر آنے والی روشنی بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کا وقت نکال لیتی تھیں۔ اگر چند گھنٹوں تک بات نہ ہوسکتی تو میری طرح وہ بھی بے چین نظر آتیں۔ جس طرح میری نگاہ ان کو ڈھونڈتی رہتی تھی' اسی طرح کبھی کبھی میں ان کی نگاہ کو بھی اپنے لئے سرگرداں پاتا۔

یہ کیسی کایا پلٹ تھی؟ فرحین دراصل نادان عینی کو مجھ سے دور رکھنے کے لئے

میری طرف متوجہ ہوئی تھیں لیکن اسی کوشش کے دوران میں ایک خود رو جذبہ ان کے اپنے اندر پروان چڑھ گیا تھا۔ ایک ایسا جذبہ جس کی واضح شکل تو مجھے معلوم نہیں تھی لیکن جس کی جھلک گاہے گاہے میں ان کی آنکھوں میں دیکھتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے اخلاق کے لئے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ اس کا ویڈیو کیمرا خراب ہوگیا۔ یہ ویڈیو کیمرا وہ "انگلینڈ" سے خصوصی طور پر شمالی علاقہ جات کی منظر کشی کے لئے لے کر آیا تھا۔ ویڈیو کیمرا خراب ہوا تو اخلاق کو یوں لگا جیسے اس کی بینائی جاتی رہی ہے اور اردگرد کی خوبصورتی اس کے لئے بے معنی ہوگئی ہے۔ اخلاق اور تنویر دو ڈھائی گھنٹے کیمرے سے سر کھپاتے رہے۔ جب وہ ٹھیک نہیں ہوا تو اخلاق نے واپس جانے کی ٹھانی۔ وہ بہر صورت کیمرا ٹھیک کرانا چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

وہ بولا۔ "شوگران میں ایک ویڈیو شاپ کا بورڈ پڑھا تھا۔ شاید وہاں سے کوئی "ہیلپ" مل سکے۔ نہ ہوا تو نیچے کیوائی جاؤں گا وہاں سے بالا کوٹ جاؤں گا.......... بلکہ ایبٹ آباد بھی جانا پڑا تو جاؤں گا لیکن کیمرا ٹھیک کرا کے لاؤں گا۔"

بڑے اور چھوٹے تایا نے بہت منع کیا' نرگس نے بھی آنکھوں' آنکھوں میں اشارے کئے لیکن کیمرے کے بغیر اخلاق کی دنیا اندھیر ہوچکی تھی۔ وہ دوپہر کے وقت تنویر کو ساتھ لے کر شوگران روانہ ہوگیا۔ میں بھی ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن ندیم نے مجھے روک لیا۔ اس کے ساتھ میری گاڑھی چھننے لگی تھی اور میرے بغیر وہ ایک دم بیزار سا ہوجاتا تھا۔

سہ پہر کو سب نے خیموں میں آرام کیا۔ تقریباً دو گھنٹے سونے کے بعد اٹھا تو موسم نہایت خوش گوار تھا۔ مطلع صاف تھا اور مسحور کن ہوا چل رہی تھی۔ فرحین مجھے کہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ خیموں میں تھیں اور نہ اردگرد' مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ انہیں ڈھونڈتا ہوا میں آبادی کی طرف چلا گیا۔ آبادی میں پہنچ کر مجھے چونکنا پڑا۔ فرحین مقامی بچوں اور عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں سوئٹس اور ٹافیوں وغیرہ کے بہت سے پیکٹ تھے۔ وہ یہ چیزیں بچوں میں تقسیم کررہی تھیں' بچے ان کی ٹانگوں سے لپٹے جارہے تھے۔ ان کی چہکاروں سے قرب وجوار گونج رہے تھے۔ وہ کسی کے

سر پر ہاتھ پھیرتیں' کسی کا منہ چومتیں۔ میرے سامنے انہوں نے چند ضرورت مند عورتوں میں نقدی بھی تقسیم کی۔

میں دور کھڑا محویت سے دیکھتا رہا۔ وہ نیکی اور رحم دلی کا مجسمہ تھیں۔ مجھے لگا جیسے وہ سرتاپا ایک شیشہ ہے اور میں سرتاپا پتھر۔ اگر میں ہلکے سے اسے چھو بھی گیا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ چکنا چُور ہوجائے گی پھر میں کیوں اس کے قریب جارہا تھا؟ کیوں اس کی زندگی کو متلاطم کر رہا تھا؟ میرا دل چاہا کہ میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں۔ رات کو جب سارے سو رہے ہوں' اپنا مختصر سامان سمیٹوں اور پاپیادہ شوگران کی طرف روانہ ہوجاؤں۔ پھر کبھی فرحین کو اپنی صورت نہ دکھاؤں اور نہ اسے اپنے خیالوں میں گھسنے دوں۔

نہ جانے میں کتنی دیر یونہی کھڑا فرحین کو دیکھتا رہا پھر فرحین کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مسکرانے لگیں۔ بچے ان سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوگئے تھے۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کوئی بچہ ان کی گود میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی کندھوں پر سوار تھا۔ ایک شریر چٹ پٹ ان کے گالوں کے بوسے لے رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھیں اور شرم سے سرخ ہوئی جارہی تھیں۔ یہ ان کا بالکل نیا روپ تھا۔ اس سنجیدہ اور متین روپ سے قطعی مختلف جو میں اکثر دیکھتا تھا۔ مجھے اپنے قریب پاکر فرحین نے ایک بچے کو گلے سے لگایا اور اس کے گال کا بوسہ لے کر بولیں۔ "بڑے تیز بچے ہیں۔ ایسے بچے اپنی جگہ آپ بنا لیتے ہیں۔"

"ہاں' کچھ بچے واقعی بڑے تیز ہوتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ یہی وقت تھا جب مجھے کچھ جیپیں نظر آئیں۔ ان جیپوں پر سوار ہو کر جو لوگ یہاں آئے تھے' وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ وہی غنڈہ پارٹی تھی جس سے پہلے جھیل سیف الملوک اور پھر شوگران میں ملاقات ہوچکی تھی۔ یہ شوخ لڑکے ہلا گلا کرتے آبادی میں پہنچے۔ جونہی گاڑیاں کھڑی ہوئیں وہ اپنے ٹینٹ اور دیگر سامان گاڑیوں سے اتارنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی ہماری طرح یہاں کیمپنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میری طرح فرحین نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ مضطرب انداز میں میری طرف بڑھ آئیں۔ میرے پاس آکر بولیں "یہ لوگ تو یہاں بھی پہنچ گئے؟"

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے ہماری تفریح برباد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"اللہ کرے آپ کا خیال غلط ثابت ہو۔" فرحین نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری پھر ذرا توقف سے بولیں۔ "ویسے ہوسکتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تشویش کا شکار ہو رہے ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ جھیل پر ہونے والے جھگڑے کے سوا اب تک خیریت ہی رہی ہے۔ شور شرابا تو یہ لوگ کافی کرتے ہیں مگر اب تک ایک حد کے اندر ہی رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نیک توقعات تو ہمیں ضرور رکھنی چاہئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ محتاط رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ ان لوگوں کو اب یہاں سری پائے میں دیکھ کر میرا یہ شک یقین میں بدلنے لگا ہے کہ شوگران میں فوزیہ سے دست درازی کرنے والا لڑکا انہی میں سے کوئی ایک تھا۔"

فرحین بولیں۔ "بہرحال میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ لوگ اپنے دماغ بالکل ٹھنڈے رکھیں۔ معمولی باتوں کو برداشت کریں' اگر یہ لوگ ایک حد میں رہتے ہیں تو ہمیں بھی بات بڑھانے سے گریز کرنا چاہئے۔"

ابھی فرحین کی بات منہ میں ہی تھی کہ ایک ٹینس بال جس پر ٹیپ چڑھی ہوئی تھی' اڑتا ہوا فرحین کے سر پر لگا۔ ان کے منہ سے "ہائے" نکل گئی۔ گیند سر کے پچھلے حصے پر لگ کر دور لڑھک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گیند مارنے والے وہی جھیل والے لڑکے تھے جو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ فرحین کو گیند لگنے میں یقیناً ان کے ارادے کو دخل تھا لیکن اب وہ یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے اتفاقاً ایسا ہوگیا ہے۔ ایک لڑکا دوسرے کو مصنوعی ڈانٹ پلا رہا تھا کہ کیا گیند پھینکتے ہوئے اسے ہم دونوں دکھائی نہیں دیئے۔ گیند پھینکنے والے لڑکے کے چہرے پر تاؤ دلانے والی ہنسی تھی۔ ایسی ہنسی مجھ سے کبھی برداشت نہیں ہوئی۔ ڈھٹائی اور شرپسندی میں گندھی ہوئی یہ ہنسی ہمیشہ میرا میٹر گھمایا کرتی ہے۔ اس وقت بھی میرا میٹر گھوم گیا۔ نتیجے سے بے پروا ہو کر میں مسکرانے والے لڑکے کی طرف بڑھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میرا ہاتھ اس کے گریبان پر آیا تھا پھر سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے دھندلا گیا۔ صبر و برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور میں اس

حد کو پار کر گیا تھا۔

چند سیکنڈ کے اندر میں نے اس لڑکے کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا' اس کی پھٹی ہوئی قمیض میرے ہاتھوں میں تھی۔ دو لڑکے اندھا دھند میری کمر پر دو ہتڑ رسید کر رہے تھے تاہم میں سامنے والے لڑکے کو زمین بوس کر کے ہی ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کی ناک پر میری زوردار ٹکر پڑی اور دوسرے کو میں نے گھما کر ایک پتھر پر دے مارا۔ اس کے بعد غنڈا گروپ کے لڑکے کالی بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ میرے ہاتھ میں کرکٹ کا بیٹ آگیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے کیا۔ دو تین کے سر پھاڑے چند ایک کے دانت توڑے' پھر میں گر گیا۔ میرے جسم پر جیسے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ مقامی لوگ بیچ میں آگئے تھے اور مجھے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن غنڈا پارٹی شاید میری جان لینا چاہ رہی تھی۔ اس دوران میں ہمارے گروپ کے دو تین لڑکے بھی موقع پر پہنچ گئے۔ وہ بھی مجھے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ میرا لباس تار تار ہو چکا تھا اور جسم کا ہر حصہ ضربوں کی زد میں تھا۔ اسی دوران میں مجھے دو تین فائر سنائی دیئے۔ یہ ہوائی فائر تھے اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' مقامی افراد میں سے ایک شخص نے کئے تھے۔

مقامی لوگوں نے کوشش کر کے مجھے مشٹنڈوں کی پارٹی سے چھڑا لیا اور میرے ساتھیوں یعنی ندیم اور رضوان وغیرہ کے حوالے کر دیا۔ میرے منہ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور پاؤں پر بھی سخت چوٹ آئی تھی۔ ندیم اور رضوان وغیرہ مجھے سہارا دے کر اپنے کیمپ میں واپس لے آئے۔ غنڈا پارٹی کی گالیاں اور ان کی للکاریں بہت دور تک میرے کانوں میں پڑتی رہی تھیں۔ مجھے فرحین کا چہرہ بار بار اپنے آس پاس نظر آرہا تھا۔ فرحین کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں.......... نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فرحین کے چہرے پر نظر آنے والی اندوہ کی پرچھائیاں میرے زخموں کے لئے مرہم کا کام دے رہی ہیں۔ "سین" تو بے شک وہی فلموں والا تھا۔ میں نے اپنے محبوب کی خاطر مارا تھا اور مار کھائی تھی لیکن اس کیفیت میں جو لذت محسوس ہو رہی تھی' میں نے اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے خیمے میں لٹا دیا گیا۔ ساتھیوں نے میری مرہم پٹی کی۔ ابتدائی طبی امداد کا سارا سامان کیمپ میں موجود تھا۔ فرحین نے مجھے درد کش دوا کے علاوہ

خواب آور دوا کا ڈوز بھی دے دیا۔ میں رات بھر اور اگلے دن دوپہر تک بے خبر سویا رہا۔

آنکھ کھلی تو پہلا احساس یہی ہوا کہ میں ابھی تک خیمے میں ہوں اور خیمے سے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ یہ ہمارے کیمپ کا نسبتاً کشادہ خیمہ تھا اور یہاں چار پانچ افراد کے لئے گنجائش موجود تھی۔ کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا اور اس کا ہاتھ بڑی آہستگی کے ساتھ میری پیشانی پر حرکت کر رہا تھا۔ یہ فرحین صاحبہ تھیں۔ وہ روئی کے پھاہے سے میری پیشانی کے زخم سے رسنے والا خون صاف کر رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ ذرا پیچھے ہٹ گئیں۔ روئی کا خون آلود پھاہا انہوں نے ایک طرف رکھ دیا اور بولیں۔ "آپ لیٹے رہیں، میں آپ کی چوٹ پر دوا لگا دوں۔"

پیشانی پر مرہم لگا کر انہوں نے اسے چپکنے والی پٹی سے ڈھانپ دیا۔ ان کے ہاتھوں کا لمس میرے جسم میں عجیب سی سنسنی جگا رہا تھا۔ عورت میرے لئے کوئی عجوبہ نہیں تھی، نہ ہی میں صنفِ مخالف کے اولین لمس کے لئے ترسا ہوا کوئی ٹین ایجر تھا، پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ فرحین کا قرب میرے جسم و جان کو بنیادوں تک ہلا دیتا تھا۔ "اب آپ کافی بہتر ہیں۔" وہ آہستگی سے بولیں۔ "رات آپ کو بخار بھی ہو گیا تھا۔"

میں کہنیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاؤں سوجا ہوا تھا۔ اس پر وِکس وغیرہ لگا کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ جسم پر اور بھی کئی جگہ ٹوٹ پھوٹ کے آثار تھے۔ خیمے سے باہر بارش زوروں میں ہو رہی تھی۔ "باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے فرحین سے پوچھا۔

وہ بولیں۔ "ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے وہ لوگ وادی کی طرف نکلے تھے۔ پندرہ بیس منٹ میں انہیں واپس آجانا تھا مگر ایک دم تیز ہوا کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ بارش تھمنے کے انتظار میں وہ کہیں رک گئے ہیں۔"

"ندیم بھی ساتھ گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ندیم اور رضوان یہیں ہیں۔ ابھی باہر نکلے ہیں۔ تیز ہوا کی وجہ سے وہ نیلا خیمہ گر گیا تھا۔ اس خیمے کا سامان دوسرے خیمے میں رکھ رہے ہیں۔"

"لڑکے پھر تو نہیں آئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، دوبارہ تو نہیں آئے.......... لیکن.......... لیکن میرا خیال ہے کہ اب مزید رسک نہیں لینا چاہئے۔ کافی تفریح ہو گئی ہے، اب واپس جانا بہتر ہے۔"

"باقی لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

"وہ تذبذب میں ہیں۔ اخلاق اور تنویر کا انتظار ہو رہا ہے۔ وہ ابھی تک شوگران سے واپس نہیں آئے۔" پھر ذرا توقف سے بولیں۔ "آپ کی کیا رائے ہے؟"

میرے ہونٹوں پر خود بخود ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "میری رائے کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ میں تو آپ لوگوں کے درمیان ایک بن بلایا مہمان ہوں۔"

"آپ کچھ زیادہ ہی قنوطی نہیں ہیں۔"

میں نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے جانے کے بعد شاید کبھی آپ سے ملاقات نہ ہو سکے.......... لیکن.......... میں اکثر آپ کے بارے میں سوچا کروں گا۔"

وہ چونک گئیں۔ ایک ساعت کے لئے ان کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں۔ اس ساعت میں ہم دونوں صرف دو انسان تھے جو شاید پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پوری آزادی کے ساتھ، بغیر کسی مصلحت یا اندیشے کے.......... لیکن اگلے ہی لمحے نگاہوں کی یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ وہ پھر سے فرحین صاحبہ بن گئیں۔ میں پھر سے بن بلایا مہمان ہو گیا۔ انہوں نے سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا سوچتے ہیں میرے بارے میں؟ میں کوئی ایسی مشکل انسان تو نہیں ہوں۔"

"آپ آسان بھی کب ہیں۔" میں نے کہا۔ "کم از کم میرے جیسا کم فہم شخص تو آپ کو سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ زمین پر پڑا ہوا کوئی کنکر چودھویں رات کے چاند سے نگاہیں ملا رہا ہو اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔"

"ایک بات کہوں؟" وہ بولیں۔

"کہیے۔"

"آپ کے ذہن میں الجھاؤ بہت ہے.......... آپ نماز پڑھا کریں۔ آپ کو بہت سکون ملے گا۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ندیم اور رضوان بھیگے ہوئے، لرزتے

کانپتے اندر آگئے۔ میری اور فرحین کی گفتگو کو فل اسٹاپ لگ گیا۔ اندر آتے ہی ندیم کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

☆======☆======☆

اخلاق اور تنویر کی واپسی اگلے روز ہوئی۔ یہاں پیش آنے والے سنگین واقعے نے انہیں بھی آزردہ خاطر کیا۔ رات گئے تک گروپ کے ارکان میں مشورہ ہوتا رہا۔ کچھ کی رائے تھی کہ ٹور کو "پیک اَپ" کرکے واپس روانہ ہوا جائے' تاہم کچھ خواتین و حضرات مخالفت کررہے تھے۔ اس دوران میں مقامی بستی کے دو سرکردہ افراد ملک خدابخش اور لندو خاں بھی ہمارے کیمپ میں پہنچ گئے۔ ان لوگوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں اور اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ فرحین نے بستی کی خواتین اور بچوں سے بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ فرحین کی محبت اور خدا ترسی نے چند ہی دنوں میں ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ خدابخش اور لندوخاں مشٹنڈوں کی ٹولی سے بات کرکے یہاں آئے تھے۔ ان دونوں نے ہمارے گروپ کو ہر طرح سے تحفظ کی یقین دہانی کرائی۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکوں کے گروپ نے یہاں شرافت سے رہنے کا وعدہ کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ جو ہونا تھا' وہ ہوچکا' اب آئندہ ان کی طرف سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ خدابخش اور لندو خاں کی باتوں سے پتا چلا کہ ویسے بھی سری پائے میں لڑکوں کا پروگرام مختصر ہے اور ممکن ہے کہ وہ پرسوں تک واپس چلے جائیں۔

غرض ایک رات تذبذب میں رہنے کے بعد گروپ نے واپسی کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اخلاق دھن کا پکا تھا۔ وہ اپنا ویڈیو کیمرا ٹھیک کروا کے ہی لوٹا تھا۔ سری پائے کے خوبصورت مناظر اسے دیوانہ کررہے تھے' وہ تنویر اور رضوان منظر کشی میں مصروف ہوگئے۔ گروپ کے باقی ارکان نے بھی اپنی دلچسپی کی مصروفیات ڈھونڈلیں۔ یہ سب چلنے پھرنے والی مصروفیات تھیں اور میں فی الحال چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ ان دو تین دنوں میں مجھے فرحین کے پاس بیٹھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ میں اپنی چوٹ کے سبب گروپ کے ساتھ نہیں جاسکتا تھا جبکہ فرحین ویسے ہی ہلا گلہ پسند نہیں کرتی تھیں۔ جب باقی خواتین و حضرات گھومنے پھرنے کے لئے نکل جاتے تو بڑی تائی دھوپ میں بیٹھتے ہی اونگھنے لگتی تھیں اور تھوڑی ہی دیر بعد باقاعدہ سوجاتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر فرحین میرا حال

چال پوچھنے میرے پاس چلی آتیں۔ ہم ہلکی پھلکی باتیں کرتے' موسم کی باتیں' خوبصورت گردوپیش کی باتیں اور قدرت کی باتیں........ لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ اس رسمی گفتگو کے پس منظر میں ایک اور "گفتگو" بھی ہم دونوں میں ہوتی ہے۔ اس گفتگو میں کوئی لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی کوئی اشارہ کنایہ تھا مگر پھر بھی کچھ باتوں کا ابلاغ نہایت خاموشی سے ہوتا رہتا تھا اور کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ اصل گفتگو یہی ہے جو پس منظر میں ہوتی ہے........... کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ یہ سب میرا واہمہ ہے' میری خام خیالی ہے۔ میں فرحین میں وہ کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کررہا ہوں جو ان میں نہیں ہے' لیکن پھر مجھے وہ یادگار نگاہ یاد آجاتی جو چند روز پہلے فرحین نے مجھ پر ڈالی تھی........... ہاں وہ یادگار نگاہ تھی۔ وہی ساعت جب وہ "مسز فرحین صاحبہ" نہیں رہی تھیں' میں اس گروپ کا بن بلایا مہمان نہیں رہا تھا' ہم دونوں نے فقط دو انسانوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ پوری آزادی کے ساتھ' بغیر کسی مصلحت اور اندیشے کے........ بالکل فطری انداز میں۔

میرے پاؤں میں خاصی چوٹ آئی تھی۔ بہرحال اب میں کوشش کرکے اسٹک کے سہارے دو چار قدم اٹھانے لگا تھا۔ ایک دن ندیم کہنے لگا۔ "تیمور بھائی! چھوڑیئے اس ڈنڈے کو۔ مجھے اس شے سے سخت نفرت ہے۔ آیئے' میں آپ کو سہارا دیتا ہوں۔ یہ لیجئے' میرے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھیے اور بے فکر ہوکر قدم اٹھایئے۔"

ندیم کے اصرار پر میں اس کے کندھے کا سہارا لے کر قدم اٹھانے لگا۔ اس وقت بڑی تائی اور فرحین کے سوا کیمپ میں اور کوئی نہیں تھا۔ بڑی تائی حسبِ معمول خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ میں نے بہت سنبھل سنبھل کر چند قدم اٹھائے۔ اچانک ڈھلوان سے پاؤں پھسل گیا لیکن یہ میرا نہیں' ندیم کا پاؤں تھا۔ یعنی جو بڑے طمطراق سے سہارا دے رہا تھا وہ خود ہی رپٹ گیا تھا۔ ندیم پشت کے بل نکیلے پتھر پر گرا' اس کی دمچی کی ہڈی پر سخت چوٹ آئی۔ بے چارے کو پہلے بھی عین اس جگہ پر چوٹ لگ چکی تھی۔ ناران میں برف پر فلم "آگ" کے سین کی نقل کرتے ہوئے وہ گر گیا تھا۔ ندیم جہاں گرا تھا وہیں پر ہائے وائے کرنے لگا۔ فرحین کو بہت کم ہنسی آتی تھی لیکن اس منظر پر وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ یعنی جس نے سہارا دینا تھا وہی چاروں شانے چت پڑا

تھا۔ میں ڈھلوان پر ایسی جگہ کھڑا تھا کہ نہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ کسی چیز کا سہارا لے سکتا تھا۔ فرحین جلدی سے آگے آئیں اور ندیم کی ہائے وائے کو نظرانداز کر کے مجھے سہارا دیا۔ وہ غیر متوقع طور پر ایک دم میرے قریب آگئی تھیں۔ میں نے ان کے جسم کو پوری شدت سے محسوس کیا اور سر تاپا ایک سنسناہٹ میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ ندیم نے نشیب سے دہائی دی۔ "غضب خدا کا.......... اس سنسار میں انصاف تو ہے ہی نہیں۔ ارے کوئی ہے جو مجھ آفت زدہ کو بھی اٹھائے۔"

ہنسی روکنے کی کوشش میں فرحین کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ایک موٹی نس ان کی پیشانی پر چمکنے لگی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ مجھے سہارا دے کر خیمے تک لے آئیں۔ ہم خیمے کے سامنے پہنچے تو ایک دم درختوں کے پیچھے سے گروپ کے کچھ لڑکے اور لڑکیاں برآمد ہوئے، ان میں فوزیہ، نرگس اور شہلا کے علاوہ عینی بھی تھی۔ وہ سب مسکراتی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ خاص طور سے عینی کی نگاہوں کا انداز تو باقاعدہ طنزیہ تھا۔ نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے۔ ہم آپ کو چھپ کر نہیں دیکھ رہے تھے۔ بس اتفاقاً یہاں موجود تھے۔"

غالباً وہ لوگ کچھ اور بھی کہتے لیکن فرحین کا احترام آڑے آیا اور وہ خاموشی سے تتر بتر ہوگئے۔ میں نے فرحین کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرتے دیکھا۔ مجھے خیمے تک پہنچا کر وہ چپ چاپ لوٹ گئیں۔ میں خیمے میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کا منظر خواب کا سا لگ رہا تھا۔ مجھے سہارا دینے کے لئے فرحین کا ایک دم میرے قریب آجانا۔ ان کے جسم کا گداز لمس، ان کے قرب کی بھینی سی مہک، ہنسی روکنے کی کوشش میں ان کا سرخ ہوتا ہوا چہرہ.......... اور پھر.......... ان حسین لمحات کے بعد اچانک فرحین کی خاموشی اور ان کے چہرے پر لہرانے والا سایہ۔ جیسے بڑی روانی سے بہتا ہوا پانی اچانک کسی پتھر سے ٹکرا کر اچھل جائے اور چونک جائے۔

میرے اندیشے کافی حد تک درست ثابت ہوئے۔ اس واقعے کے بعد فرحین جیسے ایک دم کسی خول میں چھپ گئی تھیں۔ وہ سارا دن مجھ سے دور دور رہیں اور اگلے روز بھی ان سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ دوپٹا ان کے سر پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ پیشانی کو ڈھانپتا ہوا یہ دوپٹا کانوں کے پیچھے سے اڑسا گیا تھا اور پھر گردن اور

سینے پر پھیلا لیا گیا تھا.......... اس روز شام کو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ رہی ہیں اور نماز پڑھنے کا کہہ رہی ہیں۔ خود ان کے اپنے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی نظر آرہی تھی۔ میں نے ندیم سے پوچھا۔ "یار، یہ فرحین صاحبہ کچھ زیادہ ہی "چپ شاہ" نظر نہیں آنے لگی ہیں۔"

وہ مخصوص لہجے میں بولا۔ "حیرانی کی بات یہ نہیں ہے، حیرانی کی بات یہ ہے کہ پچھلے آٹھ دس روز سے وہ خوش گوار موڈ میں نظر آتی رہی ہیں۔"

"تو پھر اب کیا ہوگیا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ کل صبح والے واقعے کا انہوں نے اثر لیا ہے۔ وہ آپ کو سہارا دے کر خیمے کی طرف لا رہی تھیں۔ اوپر سے دوسرے لوگ آگئے اور ہنسنے لگے۔ شاید فرحین باجی کو اپنے طور پر وہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔"

میرے رگ و پے میں عجیب سی بے قراری اتر گئی۔ میں جانتا تھا کہ ہمارا ساتھ بہت مختصر ہے۔ سری پائے میں ہمارا ساتواں دن تھا، بمشکل دو تین روز ہمیں مزید یہاں ٹھہرنا تھا پھر واپسی کا سفر شروع ہو جانا تھا۔ اس کے بعد فرحین سے بات چیت تو دور کی بات ہے، ان کی صورت دیکھنا بھی میرے لئے محال تھا.......... میرا اگلا دن بھی اسی کشمکش میں گزرا کہ کسی طرح فرحین سے چند الفاظ کا تبادلہ ہوسکے لیکن کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ باقی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ گروپ کے ارکان سری پائے میں انجوائے کر رہے تھے۔ آوارہ گرد لڑکوں کا گروپ بھی ابھی تک سری پائے میں ہی موجود تھا۔ یعنی اپنے پہلے بیان کے مطابق وہ دو روز بعد سری پائے سے واپس نہیں گئے تھے۔ بہرحال ان کی طرف سے کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوئی تھی۔ پہلے دن والے واقعے کے بعد حالات پرسکون ہی رہے تھے۔ ؏

☆======☆======☆

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ جوں جوں واپسی کا دن قریب آ رہا تھا' میری اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے آس پاس پاکستان کے حسین ترین مناظر تھے لیکن فرحین کی بے رخی نے ان سارے مناظر کو یاس و ناامیدی کی دھند میں چھپا دیا تھا۔ واپسی سے پہلے میں کم از کم ایک بار فرحین سے بات کرنا چاہتا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ وہ قصداً مجھے اس کا موقع نہیں دے رہی ہیں۔ وہ زیادہ وقت اپنے خیمے میں رہتی تھیں یا پھر دوسروں کے ساتھ ہی گھومنے پھرنے نکل جاتی تھیں۔ ایک دوبار میں نے انہیں بستی کی طرف بھی جاتے دیکھا۔ بستی کی عورتیں اور بچے فوراً ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ ان سے باتیں کرتیں۔ وہ اردگرد زمین پر بیٹھ کر یوں سنتے جیسے کسی عالم کا وعظ سن رہے ہوں۔ وہ ان میں کھانے پینے کی اشیاء تقسیم کرتیں اور نقد امداد بھی دیتیں۔ ایسے موقعوں پر یوں لگتا جیسے ایک نورانی ہالہ سا ان کے گرد موجود ہے۔

میرا پاؤں اب کافی اچھا تھا۔ تھوڑی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ میں چل پھر لیتا تھا۔ مناسب موسم اور مناسب ٹریٹ منٹ کے سبب باقی زخم بھی ٹھیک ہو رہے تھے......... یہ ہماری واپسی سے چوبیس گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ آوارہ گردوں کی ٹولی نے پھر ایک کام دکھایا۔ ان کا کیمپ بلندی پر واقع تھا۔ ہم نشیب میں تھے۔ رات کے وقت وہ ہمارے کیمپ کی طرف آئے اور بلندی سے کچھ شاپر وغیرہ ہمارے خیموں کی طرف پھینک دیئے۔ ان شاپروں میں کوڑا کرکٹ ہی تھا۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑے' بچا کھچا سالن' ہڈیاں اور پھلوں کے چھلکے وغیرہ۔ بلندی سے گرنے کے سبب شاپر پھٹ گئے اور یہ چیزیں بکھر گئیں۔ مقامی لوگوں نے ہمیں سختی سے منع کیا تھا کہ کھانے پینے کی بے کار اشیاء کھلے میدان میں نہ پھینکیں۔ انہیں نیچے گہرائی میں ڈال آئیں یا زمین میں دبا دیں۔ اس احتیاط میں جو حکمت پوشیدہ تھی' اس کا اندازہ رات کو ہوا۔ ہمارے خیموں سے باہر جانوروں کے غرانے اور

چلنے پھرنے کی پُراسرار آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوارہ کتے اور جنگلی بلے وغیرہ تھے وہ خوراک کی بو سونگھ کر نہ جانے کہاں کہاں سے آئے تھے۔ وہ رات بھر ہمارے خیموں سے باہر اودھم مچاتے رہے۔ کبھی وہ لڑتے جھگڑتے ہمارے خیموں سے آ ٹکراتے اور ان کی غراہٹیں دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتی رہتیں۔ وہ ساری رات بدمزگی میں گزری۔ صبح سویرے میری آنکھ لگ گئی۔ نو دس بجے کے لگ بھگ میں جاگا تو سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ ندیم اور اخلاق افسردہ سے ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ ندیم کہہ رہا تھا۔ "مگر انہیں وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی' کیا ہم نہیں تھے۔ وہ ہم میں سے کسی کو جگا دیتیں۔"

اخلاق نے کہا۔ "سب سے پہلے تو تنویر ہی سے پوچھنا چاہئے کہ وہ اکیلا وہاں کیا لینے چلا گیا تھا۔"

"بس اسے تو پنگے لینے کا شوق ہے۔" ندیم نے کہا۔

"کیا ہوا بھائیو!" میں نے خیمے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں اخلاق نے بجھے ہوئے لہجے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

صبح سویرے آوارہ گرد پارٹی کے دو لڑکے اوپر درختوں میں نظر آئے۔ تنویر ان کے پاس چلا گیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے ان سے کہا کہ ان کے پھینکے ہوئے شاپروں کی وجہ سے سب لوگ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ جواب میں لڑکوں نے کہا کہ انہوں نے شاپر درختوں پر پھینکے تھے' لڑھک کر خیموں کی طرف چلے گئے ہوں گے۔ اس "تبادلہ خیال" میں تکرار ہوئی۔ فرحین جو صبح سویرے نماز کے لئے اٹھی تھیں' نیچے سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بات بگڑ رہی ہے تو وہ تنویر کو آوازیں دیتی ہوئی اوپر چلی گئیں۔ اس وقت تک تنویر اور دونوں لڑکوں میں خاصی گرما گرمی ہو چکی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک لڑکے نے تنویر کا گریبان پکڑ لیا۔ فرحین نے بیچ میں پڑ کر دونوں کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ گر گئیں اور ان کی کہنی بری طرح چھل گئی۔ پہلو سے ان کی قمیض بھی پھٹ گئی تھی۔ لڑکوں نے جب فرحین کے بازو سے خون بہتے دیکھا تو وہاں سے کھسک گئے۔

اب اس واقعے پر سب لہو کے گھونٹ پی رہے تھے۔ سلجوق بھنایا ہوا بستی میں گیا تھا۔ تاکہ دونوں سرکردہ افراد یعنی خدابخش اور لندوخاں کو واقعے کے بارے میں

بتائے۔ ان دونوں نے ضمانت دی تھی کہ اب لڑکے کوئی شرارت نہیں کریں گے.........
سلجوق کا بستی میں جانا بیکار ہی رہا۔ ملک خدا بخش کسی کام سے کاغان گیا ہوا تھا اور لندو خاں موسمی بخار کی وجہ سے نیم بے ہوش پڑا تھا۔

گروپ میں سبھی کے چہروں پر گہری افسردگی نظر آرہی تھی' آخر وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ اس تفریح کا اختتام بڑے مایوس کن طریقے سے ہو رہا تھا۔ غور سے دیکھا جاتا تو مایوسی کے علاوہ ایک طرح کی پشیمانی بھی ہر چہرے پر موجود تھی۔ میں کوئی نفسیات داں نہیں تھا مگر جانتا تھا کہ پشیمانی کی بنیاد کمزوری پر ہے۔ جب انسان اپنے حق کے لئے لڑ نہ سکے اور مظلوم ہوتے ہوئے بھی ظالم کے خلاف مزاحمت نہ کرسکے تو اس کے اندر ایک طرح کی فرسٹریشن پیدا ہوتی ہے اور یہی فرسٹریشن پشیمانی بن کر اس کے ذہن سے چمٹ جاتی ہے۔ حساس لوگ نسبتاً زیادہ دیر تک اس سے متاثر رہتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت کا شکار ہمارے گروپ کے ارکان بھی تھے۔ چند جوشیلے ممبران مثلاً تنویر' سلجوق' رضوان وغیرہ کا خیال تھا کہ لڑکوں کی طرف سے آنے والی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ اگر بستی والے ساتھ نہیں دیتے تو پھر ایک دو بندے خاموشی سے شوگران جائیں اور پولیس کی مدد لے کر آئیں۔ دوسری طرف کچھ افراد خاص طور سے خواتین کا خیال تھا کہ اب اس جھگڑے کو اور زیادہ طول نہ دیا جائے۔ جتنا ہوچکا یہی بہت ہے۔ اگر وہ لوگ بے وقوفی کا مظاہرہ کررہے ہیں تو ہمیں بھی جواباً پاگل پن نہیں دکھانا چاہئے۔

بڑے تایا بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب اس معاملے کو ختم کیا جائے اور سامان باندھ کر یہاں سے نکلا جائے۔ سوچ بچار کے بعد گروپ نے خاموشی اختیار کرنے کے حق میں رائے دی۔ فیصلہ کیا گیا کہ جیسے تیسے آج کی رات گزاری جائے اور صبح سویرے یہاں سے روانہ ہوا جائے۔

وہ اس ٹور کی سب سے بور اور پریشان کن شام تھی۔ قریباً سارے ہی گم صم اور بیزار نظر آرہے تھے اور سب سے زیادہ بیزار میں تھا۔ میری بیزاری کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ سب اپنے گروپ کے ایک قابلِ احترام ممبر (فرحین) کی توہین برداشت کرنے مجبور ہوئے تھے اور دوسرے یہ کہ میں کوشش کے باوجود فرحین سے بات نہیں کرسکا تھا۔ کل ہمیں واپس روانہ ہوجانا تھا اور پھر نہ جانے کب ملاقات ہونی تھی اور ہونی بھی

تھی یا نہیں۔ میں گم صم سا خیمے سے باہر پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور دل ہی دل میں یہ دعا بھی کر رہا تھا کہ کل تک کوئی اور بدمزگی نہ ہوجائے۔ لڑکے ابھی تک سری پائے میں ہی موجود تھے اور کبھی کبھی ان کی کوئی ٹولی دور اوپر درختوں میں گھومتی پھرتی نظر آجاتی تھی۔

اخلاق میرے پاس آبیٹھا' کہنے لگا۔ "پروگرام بنا ہے کہ صبح ذرا جلدی نکل چلیں۔ سلجوق جیپ والوں سے بات کرنے گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جس طرح سوگواری سب پر چھائی ہوئی ہے' بہتر ہے کہ ابھی نکل چلیں' اب یہاں کیا کرنا ہے؟"

وہ بولا۔ "سب سے زیادہ دکھی تو مجھے تم لگ رہے ہو۔"

"تم نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں پریشان تو سب ہی ہیں۔ دراصل جب کسی تفریحی گروپ میں کسی ایک شخص کے ساتھ کوئی بدمزگی ہوجائے تو اس کا اثر سب پر پڑتا ہے۔" اخلاق بولا۔

"یہ بدمزگی نہیں ہے' سیدھی سیدھی ہم سب کی بے عزتی ہے' زندگی بھر جب بھی اس ٹور کو یاد کرو گے' ساتھ ہی یہ بے عزتی بھی یاد آئے گی۔"

"مگر اب کیا' کیا جاسکتا ہے؟" وہ ذرا بیزاری سے بولا۔ "جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب بات مزید بڑھانے سے کیا فائدہ.......... یہ تو جاہلوں کے ساتھ جاہل بننے والی بات ہوگی۔"

اسی دوران میں ندیم بھی پاس آبیٹھا' کہنے لگا۔ "باجی فرحین کے گرنے کے بعد تنویر نے بھی ایک لڑکے کو دھکا دے کر گرایا تھا۔ اس کے علاوہ باجی فرحین نے بھی بے نقط سنائیں اس لئے وہ دم دبا کر بھاگے تھے۔"

میں ندیم اور اخلاق کی باتیں سنتا رہا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ وہ خود کو طفل تسلیاں دینے کی کوشش کررہے تھے۔ اپنی شرمندگی کو کم کرنے کے لئے ڈھیلے ڈھالے جواز ڈھونڈ رہے تھے۔ اس صورتِ حال پر میں ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم سری پائے سے روانہ ہوگئے۔ سامان رات کو ہی پیک کرلیا گیا تھا۔ سلجوق نے جیپوں کا انتظام کرلیا تھا۔ نو بجے کے لگ بھگ وہ ہمیں لینے کے

لئے پہنچ گئیں۔ تمام لوگوں نے بڑی محبت سے ہمیں رخصت کیا۔ خاص طور سے فرحین کے لئے ان لوگوں کی گرم جوشی بہت زیادہ تھی۔ فرحین کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ غالباً اس خیال سے کہ ساتھی افسردہ نہ ہوں' وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن دیکھنے والوں کو ایسی خوشی میں افسردگی کے گہرے بادل بھی نظر آجایا کرتے ہیں۔ مقامی لوگ بھی صورت حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم اپنا پروگرام مختصر کرکے واپس جا رہے ہیں اور اس کی وجہ وہی شیطانوں کی ٹولی ہے جو حیلے بہانوں سے ہمیں پریشان کرتی رہی ہے۔ ان میں سے دو بزرگ افراد نے دبے لفظوں میں تایا جان سے کہا بھی کہ ہم لوگوں کا جانا ہی بہتر ہے۔ ہمارے ساتھ خواتین ہیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ بگڑے تگڑے لڑکے کوئی اور مسئلہ کھڑا کردیں۔

جس وقت ہم جیپوں پر سوار ہو رہے تھے' مخالف پارٹی کے لڑکے بھی ہمارے اردگرد موجود تھے۔ تاہم انہوں نے کسی طرح کی مستی نہیں کی۔ وہ اوپر درختوں میں نظر آرہے تھے اور ایک دوسرے سے چہلیں کر رہے تھے۔ چند لڑکے نیچے ڈھلوان پر بھی موجود تھے۔ وہ بظاہر اپنے آپ میں مگن نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں انہیں دیکھ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا۔ ان کی بظاہر خاموشی اور لاتعلقی میں بھی ایک شرارت آمیز طنز پنہاں تھا۔ ڈھلوان پر کھڑے لڑکے کسی وقت کورس کی شکل میں کوئی فلمی گیت گانے لگتے' کبھی چھینا جھپٹی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ ان میں ذرا بھی سمجھ داری ہوتی تو اس موقع پر ہماری نظروں سے اوجھل رہتے۔ سب لوگ جیپوں میں بیٹھ چکے تھے۔ صرف اخلاق اور تنویر جیپوں کے دروازے وغیرہ بند کر رہے تھے۔ میں سب سے پہلی جیپ کے پاس کھڑا تھا۔ اچانک نہ جانے مجھے کیا ہوا' غم وغصے کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی اور وہ قوت برداشت جواب دے گئی جو اب تک مجھے سنبھالے ہوئے تھی۔ مجھے لگا کہ اگر ان لڑکوں سے حساب چکائے بغیر ہم یہاں سے چلے گئے تو یہ پشیمانی ساری زندگی میرا پیچھا کرتی رہے گی' ان لمحوں میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ فیصلہ درست ہے یا غلط' دانش مندانہ ہے یا غیر دانش مندانہ۔ بس ذہن میں ایک ہی بات تھی۔ ہمارا یوں چلے جانا کسی طور ٹھیک نہیں کیونکہ زیادتی کرنے والے کی زیادتی سہنا بھی زیادتی کہلاتا ہے۔ غم وغصے کی ایک بلند لہر نے جیسے مجھے اٹھایا اور بہا کر ان لڑکوں کے

پاس لے گئی جو چند گز دور ڈھلوان پر موجود تھے۔ اس وقت خبر نہیں کہ میرے منہ سے کیا نکلا اور انہوں نے مجھے کیا جواب دیا۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے شریر آنکھوں والے ایک فسادی لڑکے کو گریبان سے پکڑا اور پوری طاقت سے گھما کر چیڑ کے ایک درخت سے دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ ڈھلوان پر دور تک لڑھک گیا۔ دوسرے لڑکے کے گلے میں کیمرا تھا' میرے دونوں ہاتھ کیمرے کے اسٹریپ پر آئے' میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کی ناف میں گھٹنے کی ضرب لگا کر اسے زمین چٹا دی۔ اس کے بعد ایک ساتھ تین لڑکے مجھ سے چمٹ گئے۔ یہ وہی صورتِ حال تھی جو آج سے پانچ چھ روز پہلے قریباً اسی مقام پر پیش آئی تھی۔ لڑکوں کے مکے اور ان کی ٹھوکریں میرے جسم پر برسنے لگیں۔ اس مرتبہ میرے جسم میں جیسے سرتاپا انگارے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ان حملوں کا تابڑ توڑ جواب دیا۔ قرب وجوار میں ایک دم کہرام مچ گیا تھا۔ جیپوں میں موجود خواتین چیختی ہوئی باہر نکل آئیں۔ تنویر' سلجوق' اخلاق' رضوان اور دوسرے لڑکے چند لمحے سکتے میں رہنے کے بعد میری طرف لپکے۔ دوسری طرف مشٹنڈا پارٹی کے لڑکے بھی بلندی سے چھلانگیں لگاتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ کار زار گرم ہوگیا۔ ہمارے گروپ میں لڑکوں کی کل تعداد آٹھ تھی جبکہ مخالفین گروپ کے کم وبیش پندرہ لڑکے ہمارے مقابل تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں واکنگ اسٹکس اور چمڑے کی بیلٹس بھی نظر آرہی تھیں۔ آناً فاناً زبردست مارا ماری شروع ہوگئی۔ میرے ہاتھ میں درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ آگئی۔ اس لٹھ نما شاخ نے پلک جھپکتے میں دو لڑکوں کے سر کھول دیئے۔ کم تعداد ہونے کے باوجود جب ہمیں بے جگری سے لڑتے دیکھا تو مقامی لوگوں کو بھی جیسے جھٹکا سا لگا۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ اس لڑائی میں تماشائی بنے رہیں گے تو یہ ناانصافی ہوگی.......... سب سے پہلے لندو خاں اور اس کے دوسرے ساتھی آگے بڑھے۔ اس کے بعد کئی اور افراد بھی ہماری حمایت میں لڑکوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے لئے یہ بڑی حوصلہ افزا صورتِ حال تھی۔ میں نے لندو خاں کے ساتھی کو دیکھا' اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ ایک موٹے تازے لڑکے کو رائفل کے کندے سے پیٹ رہا تھا۔ بستی کے پانچ چھ نوجوان مشٹنڈا پارٹی کے لڑکوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ یہ کایا پلٹ صرف اس وجہ سے ہوئی تھی کہ ہم نے از خود ہمت کی تھی۔ اگر ہم خاموشی سے

کان لپیٹ کر روانہ ہو جاتے تو بستی والوں کو کیا ضرورت تھی یوں لڑائی مول لینے کی۔ میرے ہاتھ میں دو لڑکوں کے گریبان تھے۔ میں نے چند سیکنڈ میں انہیں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ ان میں سے ایک لڑکے کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔ پھر میرے ہاتھ میں لندو خاں کے ساتھی کی رائفل آ گئی۔ میرے سر میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ میں نے لوڈڈ رائفل کا رخ لڑکوں کی طرف کیا اور ان کے پاؤں میں چند فائر داغ دیئے۔ دھماکوں سے وادی گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مشٹنڈے چیختے چلاتے اور گرتے پڑتے نشیب کی طرف بھاگے۔ ہمارے لڑکوں نے ان کا پیچھا کیا اور پتھر پھینکتے ہوئے ان کے پیچھے دوڑے۔ لڑکے اپنے کیمپ میں پہنچے' ہم سب بھی وہاں پہنچ گئے۔ تین چار لڑکوں کو پکڑ لیا گیا۔ ان کی یادگار پٹائی کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ نیم عریاں ہو گئے اور ہاتھ پاؤں جوڑنے لگے۔ لڑکوں کے خیمے اکھاڑ دیئے گئے۔ ان کا سامان اٹھا کر نیچے کھائی میں پھینک دیا گیا اور کیمروں کی فلمیں وغیرہ ہم نے قبضے میں لے لیں۔ فرار ہونے والے لڑکوں کی تلاش میں مقامی بستی کے لوگ چاروں طرف گھومنے لگے۔ وہ اب ہم سے بھی زیادہ مشتعل نظر آ رہے تھے' جہاں کوئی لڑکا نظر آتا' وہ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے تباہ شدہ کیمپ میں لے آتے اور اسے زمین پر لٹا کر خوب دھنائی کرتے۔ یہاں تک کہ وہ منت سماجت کرنے لگتا۔ بستی کے چند جوشیلے نوجوانوں کا خیال تھا کہ پکڑے جانے والے سارے لڑکوں کو درختوں سے الٹا لٹکا دیا جائے اور پولیس کے پہنچنے تک ان کی چھترول جاری رکھی جائے لیکن میری اور اخلاق کی مداخلت پر یہ کارروائی نہیں کی گئی۔ اسی دوران میں ایک اور سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا۔ پکڑے جانے والے ایک لڑکے کے چہرے پر گہری خراشیں نظر آئیں۔ یہ خراشیں اس کے بائیں رخسار کے علاوہ گردن اور کان کے پچھلے حصے پر بھی تھیں۔ یہ واضح طور پر ناخنوں کی خراشیں تھیں اور ڈیڑھ دو ہفتے پرانی تھیں۔ اخلاق نے لڑکے کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اوئے! یہ کس ماں سے ناخن لگوائے ہیں تم نے؟"

لڑکے کے خون آلود ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

اخلاق نے بڑے تایا کی طرف دیکھا اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "ماموں! مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہی وہ حرام زادہ ہے جس نے فوزیہ سے بدتمیزی کی تھی۔"

تنویر' ندیم اور رضوان وغیرہ ایک دم اس لڑکے پر پل پڑے۔ اس کی جرسی پھٹ گئی اور ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ وہ جاں بخشی کے لئے دہائی دے رہا تھا۔ تین چار منٹ کے اندر اندر شاہدی نام کے اس لڑکے نے اعتراف کر لیا کہ شوگران کے ہوٹل میں فوزیہ کے ساتھ اسی نے بدسلوکی کی تھی۔ اس وقت اس کے ہمراہ ایک ساتھی منیر راجہ بھی تھا۔ منیر فی الوقت مفرور لڑکوں میں شامل تھا۔ بڑے تایا نے بھی اپنے شدید غصے کے اظہار کے لئے چند ٹھڈے اس لڑکے کو رسید کئے۔

قریباً دو گھنٹے بعد کیوائی سے پولیس کی بھاری نفری جیپوں پر سری پائے پہنچ گئی۔ اتفاقاً علاقے کے ڈی ایس پی صاحب بھی اس نفری میں موجود تھے۔ یہ باریش ڈی ایس پی صاحب خالص مذہبی مزاج کے تھے۔ تفریحی مقامات کا امن برباد کرنے والی ایسی مشٹنڈا پارٹیوں کے لئے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بتا کر حیران کیا کہ لڑکوں کا یہ گروپ اس سے پہلے مری میں بھی دنگا فساد کر کے آیا ہے اور وہاں کے تھانے میں اس گروپ کے قریباً ایک درجن لڑکوں کے خلاف ایف آئی آر بھی درج ہو چکی ہے۔ وہاں ان لڑکوں نے ہوٹل کے مالکان کے ساتھ جھگڑا مول لیا تھا اور توڑ پھوڑ کی تھی۔ بعد ازاں پتا چلا تھا کہ وہ جاتے ہوئے ہوٹل کے کئی قیمتی ڈیکوریشن پیس اور کچھ نقدی بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

ڈی ایس پی خورشید شاہ صاحب نے ہمیں ہر طرح سے تسلی دی اور کہا کہ ان لڑکوں کو پکڑوا کر ہم نے فی الواقع قانون کی مدد کی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ان لڑکوں کی جان اب آسانی سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔ بے شک یہ بااثر والدین کے بچے تھے مگر جس ہوٹل میں انہوں نے ہنگامہ مچایا تھا اور چوری کی تھی' وہ بھی ایک وزیر کی ملکیت تھا۔ وزیر صاحب چند روز پہلے ہی بیرون ملک سے واپس آئے تھے اور ہاتھ دھو کر ان لڑکوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

ڈی ایس پی بہت کوآپریٹو شخص تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہم اس معاملے کو مزید طول دینا نہیں چاہتے اور نہ اس حوالے سے تھانے کچہری کے چکر میں پڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہو گئے کہ ہم اس واقعے کی باقاعدہ ایف آئی آر درج کرائیں۔

ہم اس دن کے بجائے اگلے دن سری پائے سے روانہ ہوئے مگر اس روانگی اور کل کی روانگی میں بہت فرق تھا۔ کل بجھے ہوئے دلوں کے ساتھ شرمندگی کا بوجھ لئے اور ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے ہم یہاں سے جا رہے تھے۔ آج بے شک ہمارے جسموں پر چند چوٹیں تھیں لیکن ہم ہلکے پھلکے تھے۔ ہم نے زیادتی کرنے والوں کا پنجا مروڑا تھا اور ان کی قرارِ واقعی مزاحمت کی تھی۔ سرخروئی کا یہی احساس تھا جس نے ہمارے ذہنوں سے پژمردگی کا سارا میل جھاڑ دیا تھا.......... پھر ایک اور فائدہ بھی ہوا تھا.......... اور وہ یہ کہ فوزیہ کے ساتھ ہونے والی دست درازی کا عقدہ کھل گیا تھا۔ شاہدی نامی لڑکے کے چہرے پر پائے جانے والے ناخنوں کے کھرونچوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ ڈی ایس پی خورشید شاہ صاحب اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اگر ہم اس واقعے کی رپورٹ کریں گے تو اس میں ہماری لڑکی کا نام آئے گا۔ لہٰذا انہوں نے رپورٹ کرنے پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ بہرحال آف دی ریکارڈ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس لڑکے سے "خصوصی شفقت" کی جائے گی۔

☆=====☆======☆

ہم اس روز شام کو ایبٹ آباد کے کشمیر ویو ہوٹل میں پہنچے۔ ہم اسی ہوٹل سے ناران اور جھیل سیف الملوک کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ یہیں ایک کمرے میں، میں نے گردے کے درد سے دو تین دن تڑپ تڑپ کر گزارے تھے۔۔ ایک بار پھر میرے اور ندیم کے حصے میں وہی کمرا آیا تھا۔ ندیم ایک پُرمزاح ساتھی تھا۔ وہ ہر سات آٹھ گھنٹے بعد یہ فقرہ دہرا دیتا تھا۔ "اف، اس لڑکی کے ساتھ کتنی زیادتی ہوئی ہے بھائی جان۔ میرا تو دل روتا ہے.......... اے باری تعالیٰ، اتنا بھدا شوہر۔"

ہوٹل کے اس کمرے میں پہنچ کر ٹور کے آغاز کی بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ اس مرتبہ مجھے گردے کا درد تو نہیں تھا لیکن پاؤں میں درد موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور درد تھا جو گردے کے درد ہی کی طرح مجھے بے کل کئے ہوئے تھا.......... یہ فرحین سے جدائی کا درد تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں وہ نہیں رہا جو چند ہفتے پہلے تھا۔ چند ہفتے پہلے کشمیر ویو کے کمرا نمبر ۸ میں ٹھہرنے والے تیمور اور آج کے تیمور میں کوئی بہت اہم تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اس کے سینے میں سے کچھ نکلا تھا اور ناران کے گلیشیر پر

رہ گیا تھا اور جھیل کے نیلے پانیوں میں اتر گیا تھا اور سری پائے کی دھند آلود بلندیوں میں کھو گیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا، میرے اندر ایک وسیع و عریض خلا چھوڑ گیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کو فرحین کی مسکراہٹ کے سوا دنیا کی کوئی شے پُر نہیں کر سکتی اور اگر یہ مسکراہٹ نہ ہوئی تو پھر زندگی کی آخری سانس تک یہ خلا جوں کا توں رہے گا۔

کشمیر ویو ہوٹل میں ۱۸ گھنٹوں کے قیام کے دوران میں صرف ایک بار فرحین سے میرا آمنا سامنا ہوا۔ دو سیکنڈ کے لئے ان سے نظریں ملیں۔ یوں لگا جیسے ان نظروں نے میرا شکریہ ادا کیا ہو۔ کس بات کا شکریہ! شاید اس بات کا شکریہ کہ میں نے سری پائے میں جمی ہوئی پشیمانی کی برف کو توڑا تھا۔ ان مشٹنڈوں کو دیوانہ وار للکارا تھا جو ہمارے منہ پر شرمندگی تھوپ کر ہمیں سری پائے سے رخصت کر رہے تھے.......... یا پھر ہو سکتا تھا کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔ فرحین کی نظروں نے ایسی کوئی بات نہ کہی ہو۔ انہوں نے بس یونہی مجھے دیکھا ہو۔ جیسے ریل گاڑی میں چند گھنٹے ہم سفر رہنے والے کسی شخص کو وقت رخصت دیکھا جاتا ہے.......... شام کو جب فرحین صاحبہ سب کو اٹھنے اور نماز پڑھنے کے لئے کہہ رہی تھیں، نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے وضو کیا اور ہوٹل کے برآمدے میں خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھی۔ بے کل دل کو عجیب طرح کا سکون محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے جلتے زخم پر ٹھنڈا ٹھار مرہم رکھ دیا ہو۔ میں نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو فرحین ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھی تھی۔ دونوں کہنیاں جنگلے پر ٹکا رکھی تھیں۔ ان کے لمبے گھنے بال اوڑھنی سے سنبھالے نہیں جا رہے تھے۔ وہ بار بار اوڑھنی درست کرتی تھیں مگر خود سر لٹیں پھر آزاد ہو کر اجلے چہرے پر جھولنے لگتی تھیں۔ ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آیا۔ یہ خیال جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے ذہن پر چھا گیا۔ میرا روم میٹ ندیم گھومنے پھرنے چلا گیا تھا۔ اسے فلم دیکھنی تھی، کھانا کھانا تھا اور رات گئے واپس لوٹنا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا تھا کہ میں فرحین کو اپنے اور اپنی والدہ کے بارے میں وہ تمام حقائق بتاؤں جو ابھی تک ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ یا انہیں بتائے بھی گئے تھے تو مسخ کر کے بتائے گئے تھے۔ یقیناً انہیں بتانے والوں نے ان حقائق پر ذاتی نفرت کا تیزاب پھینکا تھا اور ان کی شکلیں بگاڑی تھیں۔

میں نے اپنے دل کا بوجھ قلم کے سہارے کاغذ پر بکھیرنا شروع کیا۔ "فرحین صاحبہ! میں نہیں جانتا کہ آپ کو یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں' بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ آپ کو بتانا مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میری والدہ عطیہ شمیم کا نام تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔ وہ بڑی محنتی' جفاکش اور سیلف میڈ خاتون تھیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد انہوں نے بیٹے کی طرح اپنی ماں یعنی میری نانی کو سہارا دیا۔ انہوں نے ٹیوشنز پڑھائیں' کشیدہ کاری کی' یہاں تک کہ کالج میں تعلیم کے دوران میں پارٹ ٹائم کے طور پر ایک فیکٹری میں ملازمت بھی کی۔ وہ ادب سے لگاؤ بھی رکھتی تھیں۔ ایم ایس سی کے بعد انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی اور جلد ہی اس میدان میں نام پیدا کرلیا۔ انہیں سچ کی شاعرہ کہا گیا۔ انہوں نے اس گھٹے ہوئے منافق معاشرے میں بڑی دلیری کے ساتھ سچ بولنے کی جرأت کی۔ شاید آپ نے پڑھا ہی ہو۔ ان کی شاعری میں اس عورت کی احتجاجی چیخ نظر آتی ہے جو قرنوں سے اپنے دل کو اپنے جذبات کا مدفن بنانے پر مجبور ہے۔ ان کی شاعری پیار کی شاعری ہے اور اس کے سچے اظہار کی شاعری ہے۔ ان پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔ سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا' مطعون کیا گیا لیکن انہوں نے فطرت کو زبان دینے کا جو عزم کیا تھا' اسے متزلزل نہیں ہونے دیا اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ پڑھی لکھی نوجوان نسل کی ہر دلعزیز شاعرہ کہلائیں اور ان کی تحریروں کا ہر طبقے میں دیوانہ وار انتظار کیا گیا۔

بے شک کچھ لوگ آج بھی ان پر تنقید کرتے ہیں اور تنقید کرنا ان کا حق بھی ہے لیکن اس ساری تنقید پر عہد حاضر کے ایک نہایت سنجیدہ دانشور کا صرف ایک فقرہ بھاری ہے' اس نے لکھا تھا۔ "عطیہ کی ہر تخلیق میں اس کی ذات کی دو بنیادی صفات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پڑھنے والا عطیہ کا کتنا بڑا مخالف کیوں نہ ہو' وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ایک بے حد سچی اور بے حد باوفا عورت کی تحریر ہے۔"

میری والدہ کا سچ تو ان کی تحریروں میں ہے اور ان کی وفا' ان کی ذاتی زندگی میں نگینے کی طرح جگمگا رہی ہے۔ انہوں نے میرے والد سے محبت کی اور میرے والد نے انہیں دیوانہ وار چاہا۔ میری والدہ ایک محنت کش' متوسط خاندان سے تھیں' والد کا خاندان بلند رتبہ اور ثروت مند تھا مگر ان دونوں کی چاہت میں اتنی سچائی اور طاقت تھی کہ یہ غیر فطری دیواریں انہیں شریک زندگی بننے سے روک نہ سکیں۔ میرے والد کے خاندان نے

یعنی آپ لوگوں نے اس شادی کو دل سے قبول نہیں کیا اور ہمیشہ اس تعلق کو ختم کرنے کے آرزو مند رہے۔ بڑے تایا نے شادی رکوانے کے لئے آخر دم تک زور لگایا اور ستم یہ کہ شادی کے بعد بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ آخری حربے کے طور پر والد صاحب کو معاشی ضرب لگائی گئی تھی۔ والد صاحب کو جائیداد کے بڑے حصے سے بے دخل کردیا گیا اور کاروبار میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی گئی۔ والد صاحب حساس طبیعت کے مالک تھے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوسرے شہر جا بسے اور ان کے بڑے بھائی چاہتے بھی یہی تھے۔ انہیں یقین تھا کہ "عطیہ" نے ایک امیرزادے سے شادی کی ہے۔ اسے ایک تنگ دست' بے روزگار کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے گی تو سارے سہانے خواب ٹوٹ جائیں گے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس سے دس بیس گنا زیادہ مصیبتیں بھی آتیں تو ان کو متزلزل نہ کرسکتیں۔ وفا ان کی فطرت کا دوسرا نام تھا اور وفا انسان کو پہاڑوں سے ٹکرا جانے اور انہیں ریزہ ریزہ کرنے کی طاقت بخشتی ہے.......... میری والدہ نے ایک معروف ادبی پرچے میں ملازمت کرلی اور اپنی شب و روز محنت سے اسے مزید مقبول بنادیا۔ جلد ہی انہیں اس پرچے کا ایڈیٹر بنادیا گیا.......... کم عمری میں یہ ایک گراں بار ذمے داری تھی جسے انہوں نے بہت خوبی سے نبھایا.......... اس کے علاوہ ان کی کتابیں بھی شائع ہو رہی تھیں اور بک رہی تھیں۔ میری عمر اس وقت چار پانچ سال تھی' میں ان دونوں کی دلچسپیوں کا مرکز تھا اور میری ذات سے انہیں جینے کا حوصلہ ملتا تھا۔ والد صاحب کو معدے کی تکلیف کافی عرصے سے تھی۔ ان کے اندرونی دکھوں نے اس تکلیف کو بڑھاوا دیا اور سال دو سال کے اندر ہی وہ بستر سے جالگے۔ والدہ کی ذمے داریاں اور بڑھ گئیں۔ اس لڑکی جس نے دس برس کی عمر میں نظمیں لکھنی شروع کردی تھیں اور جس کا امیج شروع سے ایک نازک مزاج شاعرہ کا تھا' دن میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا۔ وہ نہ صرف گھر چلا رہی تھیں بلکہ شوہر کے علاج معالجے میں بھی انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی.......... ہاں فرحین صاحبہ! میری والدہ نے کئی برس ایک روبوٹ کے مانند شب و روز کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تن من کو اپنے گھرانے پر یوں نچھاور کیا کہ دیکھنے والے بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ والد صاحب پورے سات برس بستر پر رہے اور پھر ایک روز والدہ کے زانو پر انہوں نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے

لئے بند کرلیں۔ آخری وقت میں والد صاحب نے مجھے اور میری والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنا حق اپنے بھائیوں کو معاف کردیا ہے۔ میرے دل میں ان کے لئے کوئی گلہ شکایت بھی نہیں۔ تم دونوں بھی انہیں معاف کردینا۔“

اور میری والدہ نے زندگی کے آخری سانس تک والد کے حکم کی تعمیل کی۔ بے شمار مصیبتوں کے باوجود کبھی حرفِ شکایت ان کی زبان پر نہیں آیا۔ یہ اس عورت کا ظرف تھا‘ جس کے بارے میں برسوں پہلے میرے تایا حضرات نے یہ کہا تھا کہ شعرو شاعری کرنے والی اور دوپٹا گلے میں ڈالنے والی لڑکی کبھی کامیاب بیوی نہیں ہوتی‘ وہ ایک دو برسوں میں آصف (میرے والد) کو زندہ درگور کردے گی اور وہ اس سے جان چھڑانے کی ترکیبیں سوچے گا۔ بے شک وہ شعر کہتی تھیں اور دوپٹا گلے میں ڈالتی تھیں مگر انہوں نے جس طرح باکردار زندگی گزاری اور اپنے شوہر اور اپنے گھر کے ساتھ جس طرح وفا کی‘ وہ آپ کے اردگرد موجود خمیدہ گردنوں والی باپردہ نیک پروینیں نہیں کرسکتیں.......... میں قسم کھاتا ہوں کہ نہیں کرسکتیں۔ نیکی اور سچائی انسان کے دل میں ہوتی ہے‘ اس کا تعلق اس کے باطن سے کم کم ہی ہوتا ہے۔ (میں اس موقع پر عینی کا ذکر بھی کرسکتا تھا اور فرحین کو عینی کی کارستانیوں کا حوالہ دے سکتا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے لکھے بغیر ہی یہ بات فرحین کے ذہن میں آجائے گی)

والد کے بعد والدہ کے جینے کا سہارا صرف میں تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ختم کرکے مجھے پروان چڑھایا۔ میری پرورش کی اور آخر جب میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور انہیں سکھ دینے کے قابل ہوا تو انہوں نے ایک رات مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ہمیشہ کے لئے مجھے خدا حافظ کہہ کر چلی گئیں۔ میرے ددھیال والے جنہوں نے میری والدہ کی زندگی میں ان کی خبر نہ لی‘ ان کی وفات کے بعد غیروں ہی کی طرح آئے اور دو چار گھنٹے بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے دل میرے والدین کی زندگی میں پتھر بنے رہے تھے‘ بعد میں بھی پتھر ہی رہے اور شاید ہمیشہ رہیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے اندر میرے لئے کیسا کیسا زہر جمع کررکھا ہے۔ محبت کرکے سچ بولنا اور وفا کرنا کوئی اتنا بڑا گناہ تو نہیں جس کی ایسی سزا دی جائے اور میری والدہ نے صرف یہ دونوں گناہ کیے تھے۔ ان کے گناہوں کی سزا ہمیں اب تک ملتی رہی ہے اور آج بھی مل رہی ہے مگر سچ بولنے والے

اور وفا کرنے والے سزا سے خوف نہیں کھایا کرتے۔ اور ویسے بھی جب مقدر سزا ہی ہے تو پھر کیوں نہ بلا دریغ سچ بولا جائے اور وفا کی جائے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ایسا ہی کروں۔ مگر مجھے تھوڑا انتظار کرنا ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک آپ میں سچ سننے کی ہمت پیدا نہیں ہوجاتی۔ میں ایک دن آپ سے سچ بولوں گا‘ یہ میرا وعدہ ہے.......... اور ایک دن آپ سچ سنیں گی‘ یہ میرا دعویٰ ہے۔“

رات کو خط لکھ کر میں سوگیا۔ صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ فرحین برآمدے میں فجر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ بڑی تائی اور ادھیڑ عمر کی گھریلو ملازمہ بھی تھیں۔ یہ دونوں عورتیں نماز کے بعد کمرے میں چلی گئیں۔ فرحین برآمدے میں چہل قدمی کرنے لگیں۔ میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہورہی تھی۔ طبیعت میں ایک ایسی لطافت تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وضو کیا اور برآمدے میں جاکر نماز ادا کی۔ فرحین کل شام کی طرح بالکونی میں رکھی کرسی پر بیٹھی تھیں اور دونوں کہنیاں جنگلے پر ٹکا کر نیچے سڑک کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک خوبصورت‘ اجلا پن اور.......... ملکوتی سا حسن تھا ان کے چہرے پر۔ ایک عجیب سی توانائی و جرأت میرے خون میں گردش کرنے لگی۔ شاید یہ اس خلوص کی طاقت تھی جو فرحین کے حوالے سے میرے دل میں موجود تھا۔ میں کرسی پکڑ کر فرحین صاحبہ کے پاس جا بیٹھا۔ وہ ذرا سا ٹھٹکیں پھر سنبھل کر رسمی انداز میں مسکرانے لگیں۔ میں نے ان کی کہنی کی چوٹ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔ میں نے جیب سے قلم نکالا اور ایک کاغذ پر اپنے دونوں فون نمبرز لکھ کر فرحین کی طرف بڑھادیئے۔ اپنے اندر کا سارا خلوص اپنے لہجے میں سمیٹ کر میں نے کہا۔ ”یہ میرے گھر کا فون نمبر ہے اور یہ دوسرا آفس کا۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔“

ان کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ دوپٹا مضبوطی سے سر پر لیتے ہوئے وہ بولیں۔ ”آپ اباجی (تایا ابو) کو دے دیں۔“

”ان کے پاس تو ہوگا ہی بلکہ پچھلے دس برس سے ہوگا۔ یہ میں آپ کو دے رہا ہوں۔“ معمولی تذبذب کے بعد انہوں نے فون نمبرز والا کاغذ رکھ لیا۔

میں نے کہا۔ ”آپ فون کریں گی نا؟“

"اچھا دیکھوں گی۔" وہ ہولے سے مسکرائیں پھر ذرا توقف سے کہا۔ "آپ دل کے بہت اچھے ہیں۔ آپ نماز پڑھا کریں' اس کے علاوہ........." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچا کر بولیں۔ "اگر آپ کو برا نہ لگے تو کہوں گی کہ آپ اپنے ماحول میں کچھ تبدیلی لائیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ کے اندر کی خوبیاں آپ کے ماحول اور حلقۂ دوستاں کی وجہ سے دبی ہوئی ہیں اور شاید اسی وجہ سے فیملی میں آپ کا امیج بھی متاثر ہو رہا ہے۔"

"میں آپ کے مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے فون کا انتظار بھی کروں گا اور......... جہاں تک فیملی میں میرے امیج کا تعلق ہے' اس کے بارے میں' میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں' مگر وقت کم ہے اس لئے میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ تھوڑا سا وقت نکال کر پڑھ لیجئے گا۔"

میں نے تہہ شدہ کاغذ فرحین کو دے دیا۔ ان کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔ شاید وہ انکار ہی کردیتیں مگر ان کے کسی بھی ردعمل سے پہلے کاغذ ان کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی دوران میں چھوٹے تایا بڑی بڑی ڈکاریں لیتے ہوئے ہمارے سر پر آن کھڑے ہوئے اور اس ڈیڑھ کلو کڑاہی گوشت کی روداد سنانے لگے جو وہ ابھی ابھی بطور ناشتا اپنے معدے کے کنویں میں پھینک کر آئے تھے۔

اسی روز ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ میں براستہ راولپنڈی واپس لاہور روانہ ہوگیا جبکہ گروپ کے باقی ارکان پشاور چلے گئے۔ وہاں انہیں تین چار دن رکنا تھا اور ایک شادی میں شرکت کے بعد لاہور جانا تھا۔ اخلاق' ندیم اور تنویر وغیرہ نے مجھے بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا۔ عینی نے بھی گرم جوشی دکھائی لیکن یہ منفی گرم جوشی تھی۔ اس کی نگاہ جب بھی مجھ سے ملی' اس سے شعلے لپکتے محسوس ہوئے۔ میری سماعت کو مجروح کرنے کے لئے اس نے چند کاٹ دار فقرے بھی بالواسطہ میرے کانوں تک پہنچائے۔ میں اس کی برہمی کو خاطر میں نہیں لایا۔ اس کی جھلاہٹ کا جواب خاموشی سے دے کر میں نے اس کی جھلاہٹ

میں اضافہ ہی کیا ہوگا بہرحال مجھے اس کی پروا نہیں تھی......... ہاں' ایک بات میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے توقع تھی کہ بڑے تایا یا چھوٹے تایا اس موقع پر مجھ سے کچھ کہیں گے۔ تجدید تعلقات کے لئے کوئی ایک آدھ رسمی فقرہ ادا کردیں گے۔ شاید بڑی تائی ہی کہہ دیں کہ بیٹا کبھی کبھار آجایا کرو وغیرہ وغیرہ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ان بزرگ خواتین و حضرات نے چند روز پہلے کے سانحے پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یہ سانحہ ہی تو تھا کہ فوزیہ پر ہونے والی دست درازی کا الزام براہ راست مجھ پر لگایا گیا تھا۔ اب یہ الزام غلط ثابت ہوچکا تھا۔ اپنے رویے پر بڑے تایا معذرت نہ کرتے بس اتنا ہی کہہ دیتے کہ اس واقعے کی وجہ سے ہم سب کو بدمزگی کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا۔

☆======☆======☆

میں ایک چوٹ پاؤں اور دوسری دل پر لے کر لاہور واپس آگیا۔ تین چار روز بعد میں نے فرحین کے فون کا انتظار شروع کردیا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ جلد یا بدیر فرحین مجھے فون ضرور کریں گی اور کچھ نہیں تو میری اصلاح کی غرض سے ہی کریں گی۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ میرے اندر تبدیلی دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے اپنے طور پر انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میں تبدیل ہوسکتا ہوں......... اور یہ کوئی جھوٹ بھی نہیں تھا۔

میں نے بڑی بے چینی سے ان کے فون کا انتظار شروع کردیا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے' میرے انتظار میں شدت آرہی تھی اور بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ان دنوں مجھے انتظار کی کوفت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا۔ میں ہر روز اس امید کے ساتھ جاگتا تھا کہ آج فرحین صاحبہ کا فون ضرور آئے گا۔ دفتر میں پہنچتے ہی میرا دھیان کام سے ہٹ کر فون کی طرف لگ جاتا۔ ہر بار جب گھنٹی بجتی۔ میرا دل انوکھے انداز میں دھڑک اٹھتا۔ میں ریسیور اٹھا کر پرامید انداز میں ہیلو کہتا۔ دوسری طرف سے کان میں پڑنے والی آواز میرے سہانے خواب کو چکنا چور کردیتی اور یہ ٹوٹ پھوٹ کوئی ایک بار نہیں ہوئی تھی۔ جتنی بار فون کی گھنٹی بجتی تھی' مجھے اسی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہر بار کی مایوسی میرے انتظار کی شدت میں تھوڑا سا اضافہ کرجاتی تھی۔ یہ تھوڑا تھوڑا اضافہ کوہ

گراں بنتا جا رہا تھا۔

میں آفس سے پانچ بجے اٹھ جاتا تھا۔ اس سے پہلے میں عموماً دس بجے گھر پہنچتا تھا۔ درمیان کے تین چار گھنٹے دوستوں سے ملنے ملانے میں نکل جاتے تھے۔ میری اکثر شامیں شاہراہ قائداعظم کے ایک ریسٹورنٹ میں گزرا کرتی تھیں۔ پھر اسی ریسٹورنٹ سے یار لوگ کبھی کسی سینما کی طرف لے جاتے یا پھر یونہی مٹرگشت شروع ہو جاتا لیکن ٹور سے واپسی کے بعد میری یہ مصروفیات مختصر تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ شروع کے دنوں میں' میں نے نو بجے گھر پہنچنا شروع کر دیا تھا پھر مزید تبدیلی آئی اور میں آٹھ بجے گھر آنے لگا اور اب تو میں آفس سے اٹھنے کے بعد بمشکل دو گھنٹے گھر سے باہر گزارتا تھا۔ ہر لحظہ ذہن میں یہ سوچ رہتی تھی کہ شاید میرے بیڈ روم میں میرے فون کی گھنٹی بج رہی ہو اور دوسری طرف وہ آواز ہو جو میرے لئے اس دنیا کی اہم ترین آواز بنتی جا رہی ہے۔ کسی ایسی سوچ کے آتے ہی میرا رخ خود بخود گھر کی طرف ہو جاتا۔ میں سب سے پہلے ملازم دین محمد اور آیا خورشید بیگم سے کسی کال کے بارے میں پوچھتا۔ اس کے بعد بیڈ روم میں گھس جاتا۔ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے نگاہیں فون پر ہی لگی رہتیں۔ کسی وقت تو عجیب بچگانہ سا رویہ ہو جاتا میرا.......... میں فون سے دور ہوتا اور میرے پہنچنے سے پہلے فون کی گھنٹی بج کر خاموش ہو جاتی تو میں سٹپٹا کر رہ جاتا۔ گھنٹوں یہ سوچ پریشان رکھتی کہ معلوم نہیں دوسری طرف کون تھا؟ ملازم دین محمد ساٹھ پینسٹھ برس کا تھا۔ میں نے اپنے ہوش میں اسے کبھی نہیں ڈانٹا مگر ان دنوں میں ایک دو بار اسے بھی ڈانٹ پڑ گئی۔

ایک روز میں چھت پر تھا۔ فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ دین محمد کچن میں تھا' میں نے سوچا کہ وہ فون اٹھا لے گا لیکن اسے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔ اس کے ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی فون بند ہو گیا۔ میرے کان نیچے ہی لگے ہوئے تھے۔ فون بند ہونے سے مجھے سخت تاؤ آیا۔ برداشت کے باوجود میری زبان سے دین محمد کے لئے چند تلخ ترش الفاظ نکل گئے۔ وہ ہکا بکا مجھے دیکھتا رہا۔ سستی تو اس سے کئی بار پہلے بھی ہو جاتی تھی مگر مجھے اس قدر زود رنج اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ بے چارہ دین محمد فون کی گھنٹی سنتے ہی دیوانہ وار فون سیٹ کی طرف لپکنے لگا۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دنوں میں کسی کال کا بہت شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔

انہی دنوں کچھ بے تکلف دوستوں نے ہفتے اور اتوار کی درمیانی رات میرے گھر گزارنے کا پروگرام بنایا۔ ایسے پروگراموں میں اکثر وی سی آر اور تاش وغیرہ کے علاوہ شراب و کباب کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا مگر معلوم نہیں کیوں اس بار میری طبیعت اس طرف نہیں آ رہی تھی۔ بس ایک الجھن سی تھی جو مجھے بڑی شدت سے اس جانب پیش قدمی سے روکتی تھی۔ یوں صرف میری وجہ سے یہ پروگرام کینسل ہو گیا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ رات دس بجے کے لگ بھگ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔ میں نے دو تین بار ہیلو کہا۔ اپنا نام بتایا مگر دوسری طرف سے جواب نہیں آیا۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس نے پکار پکار کر مجھے کہا کہ ہو نہ ہو' یہ فرحین ہی ہیں۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھ کے ساتھ میں نے ریسیور کان سے لگائے رکھا۔ تقریباً تیس چالیس سیکنڈ بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ اس بار بھی میری ہیلو ہیلو کے جواب میں خاموشی رہی اور پانچ دس سیکنڈ بعد لائن کٹ گئی۔

فرحین کے فون کے حوالے سے میں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ خاموش کال فرحین ہی کی ہو۔ ایسی کالیں اکثر آ ہی جاتی ہیں مگر میرا ذہن اس خوش فہمی کے حصار سے نکلنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ یہ فون فرحین نے کیا ہو گا۔ ایک خوش فہمی یہ بھی تھی کہ شاید وہ میری آواز سننا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور خیال ذہن میں آ رہا تھا اور یہ خیال پہلے سے بھی زیادہ خوش آئند تھا۔ ممکن تھا کہ انہوں نے مجھے فون کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ انہوں نے بات کرنے کے لئے نمبر ڈائل کیا ہو مگر پھر ان کی ہمت نہ پڑ سکی ہو۔ ایسی صورت میں بہت زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ آج کل میں دوبارہ رنگ کریں گی۔ ان دنوں مجھ پر صحیح معنوں میں اس مقولے کی حقیقت واضح ہوئی کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں بھی آتی جاتی سانسوں کے سہارے نہیں بلکہ امید کے سہارے جی رہا ہوں۔ اگلی رات دس بجے کے لگ بھگ میری بے قراری میں اضافہ ہو گیا۔ میں باقاعدہ فون کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ آیا خورشید بیگم حسب معمول دودھ لے کر آئی۔ میں نے حسب معمول پوچھا۔ "آیا! آج کوئی کال تو نہیں آئی تھی؟"

وہ بولی۔ "کال کیا آتی بیٹا......... دوپہر سے فون بند پڑا ہے۔"

میرے جسم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے ریسیور اٹھایا' فون ڈیڈ پڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی لاتعداد بار گھر یا آفس کے فون خراب ہوئے تھے لیکن جیسی پریشانی اس رات ہوئی' کبھی نہیں ہوئی تھی......... اگلے روز سب کام چھوڑ چھاڑ کر میں فون ٹھیک کرانے کے پیچھے پڑ گیا۔ دوست احباب حیران ہو رہے تھے کہ ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے مجھ پر! بھاگ دوڑ کرکے اسی روز میں نے فون ٹھیک کرالیا۔ ایک عجیب سا خبط سوار ہو گیا تھا مجھ پر۔ دن میں درجنوں بار میں خود سے یہ سوال کرتا تھا کہ آخر فرحین کا فون کیوں نہیں آتا ہے۔ جبکہ وہ جانتی بھی ہیں کہ اس کے سوا ہمارے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں گی فون ان کے آس پاس موجود ہوگا۔ وہ اپنی انگلی کو معمولی حرکت دے کر مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں لیکن وہ نہیں کر رہی تھیں۔ تین ہفتے ہو چلے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا......... کئی طرح کے خیال ذہن میں آ رہے تھے۔ کیا وہ فون کرنا نہیں چاہتی تھیں؟ اگر وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں تو انہوں نے مجھے امید کیوں دلائی تھی؟ انتظار کی سولی پر کیوں لٹکایا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ان سے میرے فون نمبرز گم ہو گئے ہوں؟ لیکن اگر ایسا تھا بھی تو یہ کوئی ناقابلِ حل مسئلہ نہیں تھا۔ وہ میرا نمبر اخلاق یا ندیم سے حاصل کرسکتی تھیں اور کچھ نہیں تو ڈائریکٹری میں دیکھ سکتی تھیں۔ اگر وہ رابطہ کرنا چاہتی تھیں تو اس کے ایک سو ایک طریقے موجود تھے۔ ایک بات یہ بھی ہوسکتی تھی کہ مجھے انتظار کروا کر وہ میری برداشت کا امتحان لینا چاہ رہی ہوں لیکن یہ امتحان بہت طویل ہوتا جا رہا تھا۔ شب و روز کی حرکت جیسے میری نگاہوں کے سامنے جم کر رہ گئی تھی۔ وہ میری زندگی کے کٹھن ترین دن تھے۔ چند ہفتے پہلے میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ فرحین کے لئے میری پسندیدگی اتنی تیزی سے محبت اور عشق کا رنگ اختیار کر جائے گی......... اور پھر یہ عشق یوں میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا اور پیوست ہوتا چلا جائے گا۔

اس دوران میں دوبار اخلاق اور ندیم سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ تاہم یہ ملاقات میرے ہی گھر میں ہوئی باتوں باتوں میں' میں نے فرحین کے بارے میں بھی پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ آجکل بڑے تایا کی سب سے چھوٹی بیٹی کو ایف ایس سی کے امتحان کی تیاری کروا رہی ہیں اور شب و روز اس کام میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تایا اور تائی جان کے

ہمراہ عمرے پر جانے کی تیاری بھی کر رہی ہیں۔

اخلاق ٹور کی بہت سی تصویریں بھی میرے ملاحظے کے لئے لایا تھا۔ یہ تصویریں دیکھ کر ان شب و روز کی یاد پوری شدت سے تازہ ہو گئی۔ ایک ایک دن ایک ایک پل نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ ناران کی وادی' جھیل سیف الملوک کی حسین بلندیاں' شوگران کی رعنائی' غرض ہر جگہ اور ہر مقام پر مجھے مناظر کے پس منظر میں اپنی محبت کا منظر دکھائی دیا۔ میں نے چند گروپ فوٹو اپنے پاس رکھ لئے۔ ان میں سے ہر تصویر کے اندر فرحین موجود تھیں۔

یہ تصاویر میں نے دل بہلانے کے لئے رکھی تھیں لیکن انہوں نے میرے اندر جدائی کے کربناک احساس کو شدید تر کر دیا۔ میں نے قریباً ایک ماہ فرحین کے فون کا مزید انتظار کیا پھر ایک روز سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں برسوں برس بھی فرحین کی آواز کا انتظار کرتا رہا تو وہ میرے کانوں میں نہیں آئے گی۔ شب و روز میرے آفس اور گھر میں فون کی گھنٹیاں بجتی رہیں گی لیکن وہ گھنٹی کبھی نہیں بجے گی جس کا مجھے انتظار ہے۔ میں ایک لاحاصل کرب میں مبتلا ہوں اور رہوں گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ایک بار خود فرحین سے ملوں گا۔

مین نے اپنے ایک راز دار دوست طارق کے ذریعے فرحین کے معمولات کی معلومات کروائیں۔ معلوم ہوا کہ فرحین' تایا اور تائی جان کے ہمراہ عمرے پر گئی تھیں اور وہاں سے دو ہفتے پہلے واپس آئی ہیں۔ یہ بھی علم ہوا کہ فرحین کی سب سے چھوٹی نند کے ایف ایس سی کے امتحانات ہو رہے ہیں۔ فرحین اسے خود ایگزیم سینٹر لے جاتی ہیں اور واپس لاتی ہیں۔ یہ ایک حوصلہ افزا اطلاع تھی۔ ورنہ جہاں تک مجھے معلوم ہوا تھا' فرحین شاذ و نادر ہی گھر سے نکلا کرتی تھیں......... فرحین سے اس طرح ملنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن حالات کی مجبوری تھی۔

ایک روز میں نے اپنی سوزوکی کار میں فرحین کا پیچھا کیا۔ وہ ٹویوٹا کار میں سوار تھیں اور خود ہی ڈرائیونگ کر رہی تھیں۔ تایا کی بیٹی نازلی ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ فرحین نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔ وہ خاصی پرکشش نظر آ رہی تھیں۔ نازلی کو ایگزیم سینٹر پر پہنچا کر وہ واپس مڑنے لگیں تو میں ایک دم گاڑی کے قریب

چلا گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اچانک آمنا سامنا ہوگیا ہے۔ مجھے دیکھ کر فرحین کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ہمارے درمیان سلام دعا ہوئی۔ میں نے فرحین کو بتایا کہ میں برٹش سینٹر جارہا ہوں.......... برٹش سینٹر فرحین کے راستے ہی میں آتا تھا۔ وہ بولیں۔ ”آپ کے پاس سواری نہیں؟“

میں نے فوراً نفی میں جواب دیا۔ ایک ذرا ہچکچانے کے بعد انہوں نے میرے لئے دروازہ کھول دیا۔ میں ان کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایک مدھر خوشبو نے میرے حواس کو جکڑ لیا۔ معلوم نہیں کیوں فرحین کے روبرو میں خود کو ایک دم منتشر اور دبا ہوا محسوس کرنے لگتا تھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے کہا۔ ”شاید آپ یقین نہ کریں‘ میں پچھلے دو مہینے مسلسل فون کے سرہانے بیٹھا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”یہ سوال آپ خود سے پوچھیں تو بہتر ہے۔“

وہ ایک دم خاموش ہوگئیں۔ گہری سنجیدگی نے ملیح چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”کہاں سے آرہی ہیں اور کہاں جارہی ہیں؟“

وہ بولیں۔ ”نازلی کے پیپرز ہورہے ہیں۔ اسے امتحانی مرکز چھوڑنے آتی ہوں۔“

”اب کہاں جارہی ہیں؟“

”منگل کے روز ہماری خالہ کے گھر شادمان کالونی میں درس ہوتا ہے۔ آس پاس کی عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ وہیں جارہی ہوں۔ واپسی پر نازلی کو لیتے ہوئے گھر چلی جاؤں گی۔“

میں نے کہا۔ ”وعظ تو آپ اکثر سنتی ہوں گی۔ آج ایک دو باتیں میری بھی سن لیں۔ اس کے بعد شاید کبھی آپ سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولیں۔

”کچھ آگے بائیں ہاتھ پر ریسٹورنٹ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں بیٹھ جاتے ہیں‘ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا‘ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”لل.......... لیکن..........!“

”پلیز فرحین! پہلی بار اور.......... شاید آخری بار۔“

میرے لہجے میں کچھ ایسی التجا تھی کہ فرحین کے ہونٹوں پر انکار آتے آتے رہ گیا۔

بہرحال ان کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا اور آنکھوں میں خوف کی کیفیت تھی۔ مجھے ان کے چہرے پر ایک شدید کشمکش نظر آئی پھر انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ٹھیک ہے تیمور صاحب! اگر زیادہ اہم بات ہے تو میں رک جاتی ہوں مگر دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں دے سکوں گی۔“

کچھ ہی دیر بعد ہم ریسٹورنٹ کی ایک پُرسکون میز پر بیٹھے تھے۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر جھاگ دار پانی کے فوارے خوشگوار منظر پیش کررہے تھے۔ میں نے کہا ”فرحین! آپ کو یاد ہے ”پائے“ میں آپ نے ایک روز مجھے قنوطی کہا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ میں زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کو نظرانداز کرنے کا عادی ہوں۔“

”شاید کہا ہو۔“ وہ بولیں۔

”آپ نے کہا تھا.......... اور آج یہی بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ مجھ سے زیادہ قنوطیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ اپنے اردگرد سے لاتعلقی کی ایک دھند ہے جو آپ کی پوری زندگی پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی جینے کے لئے ہے لیکن آپ زندگی گزار رہی ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ کاٹ رہی ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ میرے حوالے سے کچھ غلط قسم کے تصور آپ کے ذہن میں موجود ہیں۔“ فرحین نے کہا۔ ”میں مایوس ہوں اور نہ زندگی سے لاتعلق ہوں بلکہ میں تو کہوں گی کہ میں آپ جیسے لوگوں سے کہیں زیادہ بھرپور زندگی گزار رہی ہوں۔ اپنے اہل خانہ کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہوں‘ خدا نے جتنی ہمت اور توفیق دی ہے‘ اس کے مطابق خلق خدا کی بھلائی کی کوشش کرتی ہوں۔ اپنے رب کی عبادت کرتی ہوں۔ میں ہر طرح سے مطمئن اور خوش ہوں۔“

”معاف کیجئے گا‘ آپ غلط کہہ رہی ہیں۔“ میں نے بے باک لہجے میں کہا۔ ”آپ نے اپنی جتنی مصروفیات گنوائی ہیں‘ بے شک وہ مبارک ہیں لیکن ان کے پیچھے ایک وسیع و عریض خلا بدستور موجود ہے۔ آپ خود کو کتنا بھی مصروف کرلیں‘ یہ خلا نہ صرف موجود رہے گا بلکہ پھیلتا چلا جائے گا۔“

”کیا آپ مجھے نفسیاتی مشورے دینے کے لئے یہاں لائے ہیں؟“

”آپ نے بھی تو مجھے اس سے ملتے جلتے مشورے دیئے تھے۔ ان مشوروں کے نتیجے

میں' میں نے خود کو کافی بدلا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ میرے ناچیز مشورے کے نتیجے میں آپ بھی خود کو تھوڑا بہت بدلنے کی کوشش کریں اور نہ بھی کریں مگر کم از کم سنیں تو سہی۔"

"آپ کی باتیں بہت الجھی ہوئی ہیں۔"

"مشکل مسئلوں کے بارے میں جو باتیں کی جاتی ہیں' وہ اکثر الجھی ہوئی ہی ہوتی ہیں۔"

"گویا آپ کے نزدیک میں کسی مشکل نفسیاتی مسئلے کا شکار ہوں؟" فرحین کا لہجہ قدرے خشک تھا۔

"میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔" میں نے بے باکی سے کہا۔ "میں واقعی ایسا سمجھتا ہوں کہ آپ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں۔"

"مسٹر تیمور! آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں' ذرا صاف لفظوں میں کہیں۔"

میرے سینے میں عجیب سی بے باکی کا نقارہ بج رہا تھا اور اس کی گونج میرے پورے بدن میں تھی۔ میں نے فرحین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "فرحین! آپ شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟"

فرحین کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ ایک دو سیکنڈ کے لئے لگا کہ وہ مجھ پر پھٹ پڑیں گی لیکن پھر انہوں نے خود پر قابو پایا اور سنبھلتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"تیمور صاحب! میں نے آپ کو اپنی نجی زندگی میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی۔"

"لیکن آپ نے ابھی گاڑی میں وعدہ کیا تھا کہ میری بات سنیں گی۔"

"مگر میں ایسی بے ہودہ گفتگو نہیں سن سکتی۔"

"یہ کس لحاظ سے بے ہودہ گفتگو ہے؟ انسانی لحاظ سے؟ سماجی یا مذہبی لحاظ سے؟ کس لحاظ سے یہ بے ہودہ ہے؟ ہمارا دین.......... دینِ فطرت ہے۔ ہمارے دین میں کہاں لکھا ہے کہ عورت نکاح کے بعد ساری زندگی کے لئے مرد کے پلے سے بندھ جاتی ہے۔ پھر وہ مرد چاہے کیسا بھی ہو' عورت ہمیشہ کے لئے اس کے ظلم اور بے وفائیاں برداشت کرنے کی پابند ہے اور اس بات کی پابند ہے کہ وہ مرد کی طرف سے دھتکارے جانے کے باوجود اس کی زندگی سے چمٹی رہے اور منافقت اور جھوٹ کے سہارے جیتی رہے۔ صرف اور

صرف اس لئے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ آپ مجھے بتائیں آپ کے نزدیک لوگ اور معاشرہ زیادہ اہم ہے یا خدائی قانون؟ بے شک ہمارے دین نے طلاق کو بہت ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے لیکن یہ حرام نہیں ہے اور جب برے حالات میں خدا نے اسے حرام قرار نہیں دیا تو پھر معاشرے کے خوف سے ہم اسے حرام کیوں قرار دیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم مذہب کے بھی بس وہی احکامات درست سمجھتے ہیں جن کی تائید معاشرہ کرتا ہے.......... کیا یہ گناہ نہیں کہ ہم مذہب پر معاشرے اور روایات کو ترجیح دیں.......... اور فطرت کے راستے کو چھوڑ کر خود ساختہ پابندیوں میں خود کو جکڑ لیں؟"

فرحین کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ رنگ متغیر ہوگیا۔ وہ بولیں "معاف کرنا تیمور صاحب! آپ طلاق کو موضوع بنا رہے ہیں۔ آپ کے والد اور والدہ کو بھی تو علیحدہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی تھی پھر آپ کے والد نے طلاق کیوں نہ دی اور والدہ نے کیوں نہ لی؟"

"اس کا جواب یہ ہے مسز فرحین! کہ ان لوگوں نے یہ قدم اپنی "مثالی محبت" کی خاطر نہیں اٹھایا تھا اور آپ یہ قدم صرف اس لئے نہیں اٹھا رہی ہیں کہ معاشرے کے خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہیں۔"

میرے الفاظ کافی سخت تھے۔ فرحین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ بولیں۔ "جن باتوں کا آپ کو علم نہیں' وہ باتیں مت کریں۔ آپ اپنے طور پر عالم فاضل بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر.........."

"میری بات سنیں۔" میں نے فرحین کی بات کاٹی۔ "میں عالم فاضل نہیں ہوں اور جو بات میں کہہ رہا ہوں' اسے کہنے کے لئے عالم فاضل ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ سیدھی سادی بات ہے فرحین صاحبہ.......... خدا نے مرد اور عورت کا تعلق اس لئے بنایا کہ دونوں ایک دوسرے کے غم گسار ہوں' ایک دوسرے کی محرومیوں' خواہشوں اور تقاضوں کا مداوا کریں تاکہ فطرت اپنے راستے پر روانی سے بہتی رہے لیکن اگر میاں بیوی میں سے ایک سات سمندر پار جاکر بیٹھ جائے' پچھلی زندگی کے بارے میں سب کچھ بھول جائے' اپنی نئی دنیا بسالے' نیا جیون ساتھی ڈھونڈ لے۔ پہلے ساتھی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے' برسوں برس گزر جائیں اور اس پہلے ساتھی کی صورت تک نہ دیکھے تو پھر کہاں رہ

جاتی ہے فطرت کی روانی' کہاں باقی بچتا ہے وہ مقدس معاہدہ جو زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ پھر تو ایک بند جوہڑ میں ٹھہرا ہوا پانی رہ جاتا ہے' جس کے اندر مصلحت کی کائی اُگ آتی ہے۔ اس میں منافقت کے کیڑے تیرتے ہیں اور فطرت اس کے کنارے بیٹھ کر رات رات بھر روتی ہے۔ اس جوہڑ سے اٹھنے والی بساند کو کبھی وظیفہ جات کی اگر بتیوں میں چھپایا جاتا ہے' کبھی فلاحی کاموں کی دھونی دی جاتی ہے' کبھی صبرو برداشت کے ملبے سے ڈھانپا جاتا ہے۔ ان کوششوں سے بے شک حس شامہ کو سکون ملتا ہے اور ماحول صاف ستھرا محسوس ہوتا ہے لیکن وہ بساند تو اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور اندر ہی اندر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ میں آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوں لیکن اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ............"

"پلیز! آپ خاموش ہوجائیں۔" فرحین نے میری بات قطع کی۔ "اگر آپ نے میرے سامنے طلاق کا لفظ استعمال کیا تو میں برداشت نہیں کرسکوں گی۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں' پلیز آپ خاموش ہوجائیں۔"

"کیوں خاموش ہوجاؤں؟" میں نے بلا توقف کہا۔ "طلاق کا لفظ میں کیوں استعمال نہ کروں' کس کتاب' کس حدیث میں لکھا ہے کہ طلاق کا لفظ زبان پر لانا گناہ ہے؟............ میں پھر معافی چاہتا ہوں فرحین صاحبہ! آپ کی باتیں مجھے دکھ پہنچا رہی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں آپ کے سامنے نہیں ہندی دیومالا کی کسی ستی ساوتری ناری کے سامنے بیٹھا ہوں۔ یا پھر اس ناری کی روح نسل در نسل بھیس بدل بدل کر انسانی خون میں سفر کرتی ہوئی آپ تک آپہنچی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اب بھی آپ کے خون میں سانس لے رہی ہے............ وہی ستی ساوتری جو اپنے فرسودہ عقائد کو سینے سے لگا کر اپنے پتی کی چتا میں چھلانگ لگادیتی تھی اور زندہ جل کر اپنی دانست میں وابستگی کا حق ادا کردیتی تھی............ وہ ایک کہنہ تاریک عقیدے کی پیروکار تھی' آپ صبح صادق جیسے اجلے عقائد کی علمبردار ہیں۔ آپ کی زبان سے ایسی باتیں سن کر دکھ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟"

فرحین کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ان کا پُروقار انداز لرزہ براندام تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔ "مسٹر تیمور! آپ کو یہ باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

میرے لہجے میں ایک پُرخلوص تپش برق کی طرح لہرا گئی' میں نے کہا۔ "مجھے حق پہنچتا ہے فرحین! اس لئے کہ میں............ آپ............ آپ سے پیار کرتا ہوں............ اور

مجھے حق پہنچتا ہے۔ اس لئے کہ آپ............ بھی............ مجھ سے............ پیار کرتی ہیں۔"

جیسے ایک چھناکے سے بہت بڑا فانوس فرش پر گر کر چکنا چور ہوگیا۔ فرحین پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھتی چلی جارہی تھیں۔ ان کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا' ایک سکتے کی سی کیفیت تھی۔ ان کے دونوں سرخ و سپید ہاتھ میز پر دھرے تھے' کلائیوں میں آڑھی ترچھی چوڑیاں بھلی لگ رہی تھیں مگر یہ ہاتھ جذبات کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ ان لمحات میں میرے دل کے اندر یہ نہایت شدید خواہش پیدا ہوئی کہ میں ان ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دوں اور ان کی ساری لرزش' حدت اور لطافت کو ہمیشہ کے لئے اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرلوں مگر یہ خواہش............ خواہش ہی رہی۔ انہوں نے نہایت غضب ناک سرگوشی میں کہا۔ "آپ............ آپ نہایت بے ہودہ شخص ہیں۔ میں لعنت بھیجتی ہوں آپ کی بکواس پر۔"

انہوں نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "آپ اس وقت غصے میں ہیں' میری باتوں پر ذرا............"

"یُو شٹ اَپ!" انہوں نے تیزی سے میری بات کاٹی اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئیں۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا پھر پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

اس گفتگو کا انجام میری توقع سے زیادہ تلخ ہوا تھا۔ بہرحال یہ تسلی تو مجھے تھی کہ جو کچھ میرے دل میں تھا' وہ میں نے فرحین کے سامنے کھول کر بیان کردیا ہے۔

☆======☆======☆

اگلا ایک ہفتہ میں نے سخت پریشانی میں گزارا۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب فرحین کا خیال میرے ذہن میں نہ ہو۔ اس کے یاد آنے کے ہزارہا بہانے تھے اور بہانوں کا یہ سلسلہ صبح سے رات گئے تک ٹوٹتا نہیں تھا۔ ایک دو لڑکیوں سے میری عام نوعیت کی دوستی تھی لیکن اب ان کی طرف سے دھیان یکسر ہٹ گیا تھا۔ نائلہ نامی لڑکی میری کلاس فیلو بھی رہی تھی۔ ان دنوں وہ ماڈلنگ کے شعبے میں قسمت آزما رہی تھی۔ اس کے کئی فون آئے' ایک دو مرتبہ وہ گھر تک بھی آئی مگر اس سے میری بات چیت چند فقروں سے آگے نہ بڑھ سکی............ یوں لگتا تھا کہ اب میں سرتاپا ایک بدلا ہوا شخص ہوں۔ زمین اور آسمان کے قلابے میں فرحین کے سوا اور کچھ باقی ہی نہیں رہا تھا۔ محبت کے مارے لوگوں کے بارے

میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی راتیں کانٹوں پر گزرتی ہیں اور وہ اختر شماری کرتے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ مگر میرا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ سارا دن تو فرحین کی یاد دامن گیر رہتی تھی اور کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ مگر رات کو دس پندرہ منٹ کروٹیں بدلنے کے بعد نیند آجاتی تھی اور میں صبح تک سویا رہتا تھا۔ ہاں صبح جاگتے ہی جو سب سے پہلا خیال آتا تھا وہ فرحین کا ہوتا تھا۔ دل سے ہوک سی اٹھتی تھی کہ ایک اور دن فرحین کے بغیر گزر گیا۔

آٹھویں دسویں روز کی بات ہے۔ رات کو فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا' دوسری طرف فرحین تھیں۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کتنی ہی دیر میرے ہونٹوں سے آواز نہیں نکل سکی پھر میں نے کہا۔ "زہے نصیب' آپ نے کیسے یاد فرمالیا؟"

ان کا لہجہ دھیما اور نرم تھا' بولیں۔ "میں نے آپ سے معافی مانگنے کے لئے فون کیا ہے؟"

"کس بات کی معافی؟"

"اس روز میں نے آپ سے بڑے سخت لہجے میں بات کی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ اردگرد لوگ موجود ہیں۔ میں اس پر شرمندہ ہوں۔"

"اس لحاظ سے مجھے تو دگنا شرمندہ ہونا چاہئے۔"

"خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ آپ سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں جس انداز سے سوچا' وہ صحیح نہیں ہے۔ میں آپ کے احساسات کی قدر کرتی ہوں لیکن میں ایک مختلف عورت ہوں' اس کے سوا مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

"لیکن مجھے تو کچھ کہنا تھا۔"

"ضروری تو نہیں کہ انسان جو کچھ سوچے وہ کہہ بھی ڈالے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ کچھ بھی نہ کہئے۔ میری فون کال سننے کا بہت شکریہ.......... مجھے تو ڈر تھا کہ شاید آپ میری آواز سن کر فون ہی بند کردیں۔"

ایک دو رسمی کلمات کے بعد بات ختم ہوگئی۔

یہ کوئی حوصلہ افزا کال نہیں تھی پھر بھی کسی نہ کسی طرح میں نے اس میں سے امید کا پہلو ڈھونڈ لیا۔ مجھے امید تھی کہ شاید چند دنوں یا چند ہفتے بعد فرحین دوبارہ رابطہ کریں

گی' لیکن یہ نہیں ہوا۔ انہی دنوں ایک روز اخلاق میرے پاس آیا تو اس کے ہاتھ میں شادی کارڈ تھا۔ اس کی اور نرگس کی خانہ آبادی ہو رہی تھی۔ یہ بڑی خوشی کا موقع تھا لیکن میرا دل دوبارہ ان لوگوں میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اخلاق نے بے حد اصرار کیا' میں انکار کرتا رہا' آخر نوبت ناراضگی تک پہنچ گئی۔ میں نے ہامی بھرلی۔ ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں شاید یہ خواہش بھی پوشیدہ تھی کہ شادی کی اس تقریب میں فرحین کو دیکھنے اور ممکن ہے کہ ان سے بات کرنے کا بھی موقع ملے۔

☆======☆======☆

شادی کی یہ تقریب بہت بھرپور اور زور دار تھی۔ تین چار دن مہندی' بارات اور ولیمے وغیرہ کا ہنگامہ رہا۔ فرحین صاحبہ سے بس علیک سلیک کی حد تک ہی بات ہوسکی۔ حسین' چنچل اور شوخ خواتین کے ہجوم میں وہ اپنی پُروقار سادگی اور سنجیدگی کے سبب سب سے جدا نظر آتی تھیں۔ میں نے انہیں گانے بجانے کے ہنگاموں سے دور دور دیکھا۔ نماز کے اوقات میں وہ خاموشی کے ساتھ اوجھل ہوجاتی تھیں۔ چند بار ان سے نگاہیں چار ہوئیں۔ میں کوشش کے باوجود ان نگاہوں میں اپنے لئے موہوم سی امید بھی نہیں ڈھونڈ سکا۔ جس روز سری پائے میں' میں اپنی زخمی ٹانگ کے باعث لڑکھڑا کر گرا تھا اور فرحین نے مجھے سہارا دیا تھا' اس دن کے بعد سے کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا تھا جب میرے سامنے ان کی سنجیدگی کی دیوار میں کوئی دراڑ پیدا ہوئی ہو۔ شاید وہ آخری مسکراہٹیں تھیں جو میں نے ان کے چہرے پر دیکھی تھیں۔

اخلاق کا ولیمہ اس کی کوٹھی کے وسیع وعریض سبزہ زار میں ہوا تھا۔ دعوت ولیمہ کے بعد لڑکیوں کے ایک گروپ نے دولہا دلہن سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ پہلے بیت بازی اور پھر گیت بازی کا مقابلہ ہونے لگا۔ میں اس ہنگامے سے اکتا کر چھت پر ٹہلنے کے لئے چلا گیا۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہاں یوں فرحین سے ملاقات ہوجائے گی۔ وہ اپنی جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف رکھ رہی تھیں' دوسرے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ مجھے دیکھ کر ان کی تسبیح اوڑھنی کے نیچے کہیں اوجھل ہوگئی۔

میں نے "السلام علیکم" کہا۔ انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر انہوں نے کہا۔ "نیچے تو خوب رونق میلہ ہے' آپ اوپر

چلے آئے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو کوئی رونق نظر نہیں آتی۔"

"کیا مطلب؟"

"بس ایسے ہنگاموں میں اب دل نہیں لگتا۔"

"کیوں؟"

"اس کا تو مجھے خود بھی علم نہیں.......... بائی دی وے' آپ کو بھی تو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں.......... ایسی بات تو نہیں۔ بس نماز کا وقت تھا اس لئے اوپر آ گئی۔" چند لمحے خاموشی رہی پھر انہوں نے پوچھا۔ "ٹور کے دوران میں تو آپ ایسے ہلے گلے میں بہت خوش رہتے تھے۔"

"بس.......... میں خود کو کچھ بدلا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔"

"اگر یہ مثبت تبدیلی ہے تو بہت اچھی بات ہے۔"

"اس تبدیلی میں دو مثبت باتیں ہیں۔ ایک تو یہ مثبت تبدیلی ہے' دوسرے آپ کی وجہ سے آئی ہے۔" میں نے بے باکی سے کہا۔

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں۔ سچی کھری بات تو یہ ہے کہ جو کام میری والدہ سے بھی نہ ہو سکا' وہ آپ نے کر دکھایا ہے۔ میں کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی برائیاں تھیں لیکن اب میں ہر روز خود کو پہلے سے کچھ بدلا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

ان کے چہرے پر عجیب سی چمک نظر آئی۔ اس میں خوشی کی جھلک تھی اور اس فخر کا احساس بھی کہ ان کی ذات کے حوالے سے کسی کے لئے بہتری کی کوئی صورت نکلی ہے۔

"میں آپ کو چند کتابیں بھجواؤں گی.......... وہ پڑھئے گا۔" جیسے ایک دم ان کے منہ سے نکل گیا۔

"ضرور بھجوایئے گا' میں انتظار کروں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

خوش گوار ہوا کے شریر جھونکے ان کی اوڑھنی سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ انہوں نے اوڑھنی کو مضبوطی سے ٹھوڑی کے نیچے تھاما اور مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے نیچے چلی

گئیں۔

تین چار دن بعد مجھے گھر کے پتے پر ایک پارسل موصول ہوا۔ اس میں چند کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کے موضوعات فلسفہ اور انسانی نفسیات تھے۔ دو کتابیں خالص اسلامی نوعیت کی تھیں۔ میں نے ان کتابوں کو جستہ جستہ پڑھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کتابوں سے بھی زیادہ تحریک مجھے فرحین کی ذات سے مل رہی تھی۔ میں واقعتاً خود میں تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا اور میرے دل کی گہرائی میں تبدیلی کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔

چند روز بعد فرحین کا فون ملا۔ انہوں نے مجھ سے کتابوں کے بارے میں پوچھا۔ یہ جان کر ان کے لہجے میں خوشی کی جھلک محسوس ہوئی کہ میں نے کتابوں میں دلچسپی لی ہے۔ وہ مجھ سے ناصحانہ لہجے میں باتیں کرتی رہیں تاہم الفاظ کا انتخاب ایسا تھا کہ نصیحت کا بھاری پن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں قائل ہو گیا کہ وہ گفتگو کرنا جانتی ہیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے اخلاق کا ذکر بھی کیا' کہنے لگیں۔ "وہ آپ کا دوست ہے۔ آپ کی بات مانتا بھی ہے۔ اسے تھوڑا بہت سمجھاتے رہا کریں۔ دنیا کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ دھیان تو دین کی طرف بھی ہونا چاہئے۔ اخلاق کے مشورے سے نرگس نے بال کٹوالئے ہیں۔ کبھی کبھی پتلون بھی پہن لیتی ہے۔ رات گئے تک وی سی آر پر فلمیں دیکھتے ہیں۔ دوپہر گیارہ بجے بھی ان کے گھر پہنچو تو سوئے ہوئے ملتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "شادی کے بعد وہ صرف ایک دوبار مجھ سے ملا ہے۔ اب جب بھی ملے گا اس سے بات کروں گا۔"

آٹھ دس منت کی گفتگو کے بعد فرحین نے خدا حافظ کہہ دیا۔ میں ان کی گفتگو پر غور کرنے لگا۔ بڑا نفسیاتی انداز تھا ان کا.......... وہ مجھے اخلاق کو سمجھانے کا کہہ رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کسی دوسرے کو سمجھاتا ہے تو وہ اپنے آپ پر بھی غور کرتا ہے کہ کہیں وہ خامیاں اس کے اپنے اندر بھی تو نہیں ہیں۔ یوں بالواسطہ اس کی اپنی اصلاح بھی ہوتی ہے۔

☆======☆======☆

اس کے بعد کبھی کبھار فرحین کا فون آنے لگا۔ ان کی آواز میرے دل کے ویرانے کی قسمت جگا دیتی۔ بنجر کان جیسے سیراب ہونے لگتے۔ میں بہت کم بولتا' یوں انہیں زیادہ

بولنے کا موقع ملتا اور میں زیادہ دیر تک ان کی آواز سن سکتا تھا۔ ان کی گفتگو کے موضوعات زیادہ تر اخلاقی ہی رہے۔ اگر اخلاقیات کے علاوہ بات ہوتی تو بھی اس کا لب لباب، اخلاقیات ہی ہوتا۔ وہ الفاظ کا انتخاب اتنی احتیاط سے کرتیں کہ کسی مرحلے پر بھی یہ گمان نہ ہوتا کہ وہ سمجھانے بجھانے کا کام کر رہی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر ایک تعلق بھی ہمارے درمیان پروان چڑھ رہا تھا۔ ایک طرح کی وابستگی آپوں آپ وجود میں آ رہی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور فون کرتی تھیں۔ اگر کبھی ان کا فون نہ آتا تو میں شدت سے انتظار کرتا اور گھر کے خالی کمروں میں بے قرار پھرتا۔ ایک بار مجھے کام کے سلسلے میں تین ہفتے کے لئے فرم کے برانچ آفس سنگاپور جانا پڑ گیا۔ میری واپسی پر فرحین نے مجھے بتایا کہ وہ عادتاً ہر ہفتے مجھے رنگ کرتی رہی ہیں.......... اور یہ حقیقت تھی کہ ہمیں ایک دوسرے کی عادت سی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دو بار میں نے دل کڑا کر کے فرحین سے اس کی نجی زندگی کے بارے میں بات کرنا چاہی لیکن انہوں نے مجھے جہاں کا تہاں روک دیا۔ مجھے شدید خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ہماری بات چیت کو ہمیشہ کے لئے فل اسٹاپ نہ لگ جائے۔ وہ اس موضوع کا ذکر تک پسند نہ کرتی تھیں اور نہ مستقبل میں یہ امید نظر آتی تھی کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی کریں گی۔ کبھی کبھی ہم ایک ایک گھنٹا بھی فون پر بات کرتے رہتے لیکن مجال ہے کہ اس گفتگو میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا آتا جسے کسی بھی لحاظ اور معیار سے نامناسب قرار دیا جاسکتا۔

مگر یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ بے شک وہ مجھ سے بے حد محتاط گفتگو کرتی تھیں لیکن گفتگو کرتی تو تھیں۔ اس گفتگو کے لئے وہ مجھے فون کرتی تھیں۔ بے شک ہمارا تعلق ایک ہی فیملی سے تھا مگر ہم نامحرم تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اہل خانہ کو بتا کر یا ان سے اجازت لے کر تو فون نہیں کرتی تھیں.......... اس پہلو پر میں غور و خوض کرتا تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی' وہ میرے ساتھ اپنی گفتگو کو صرف اور صرف میری اصلاح کے پس منظر میں دیکھتی تھیں۔ میرے ساتھ گفتگو کے لئے لاشعوری طور پر انہوں نے جو جواز ڈھونڈا تھا' وہ یہ تھا کہ وہ اپنی بات چیت کے ذریعے مجھے سنوارنے کی کوشش کر رہی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ میں سنور رہا تھا۔ بلا ارادہ سنورتا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے اندر ایک خلا بھی پیدا ہو رہا تھا اور یہ فرحین کا خلا تھا۔ اس خلا کو دنیا میں فرحین کے

سوا اور کوئی پُر نہیں کر سکتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ کیا فرحین اس خلا سے آگاہ ہیں۔ پھر میں سوچتا تھا کہ کیا فرحین کے اندر بھی کوئی ایسا خلا موجود ہے۔ دل کی گہرائیوں سے پھر آواز آتی تھی کہ ہو نہ ہو ایسا خلا موجود ہے۔

وہ گرما کی ایک چاندنی رات تھی۔ فرحین کا فون آیا۔ مجھ پر عجیب سا موڈ طاری تھا۔ قریباً ایک برس سے دل میں جو باتیں مچل رہی تھیں' وہ لب پر آنے کے لئے بے قرار تھیں۔ پیمانہ صبر چھلک رہا تھا۔ باتوں کے دوران میں' میں نے کہا۔ "فرحین! کبھی کامران صاحب کی امریکا سے کوئی خیر خبر آئی ہے؟"

"نہیں۔" مختصر جواب ملا۔

"کبھی آپ نے کوشش کی رابطہ کرنے کی؟"

"اوں ہوں۔"

"کبھی دل میں خیال نہیں آیا کہ ایسا کروں؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر فرحین کی سپاٹ آواز ابھری۔ "تیمور صاحب! آپ پھر وہی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"فرحین!" میں نے بڑی التجا سے کہا۔ "ہماری گفتگو میں کیا یہ حدبندیاں بہت ضروری ہیں؟"

"ہاں' بہت ضروری ہیں۔" انہوں نے غالباً مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر میں کچھ کہنا چاہوں تو؟"

"ضروری تو نہیں کہ ہر بات کہی جائے۔ کچھ باتیں بن کہے اچھی لگتی ہیں۔"

"لیکن اگر کچھ باتیں دل کا بوجھ بن جائیں تو؟"

"ایسی باتوں کو دل سے نکال دینا چاہئے یا پھر خدا سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ اس بوجھ کو سہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

"کیا محبت کا مقدور صرف قربانی ہے؟"

"محبت تو قربانی ہی کا دوسرا نام ہے۔"

"اگر ایسی بات ہوتی تو خدا صرف "قربانی" پیدا کرتا' اس نے محبت کیوں پیدا کی۔ کیوں انسان کے سینے میں تمنا چھپائی اور کچھ پانے کی خواہش اس کے سینے میں "نصب

کی؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میرا تو خیال ہے کہ محبت میں ہم جو قربانی دیتے ہیں' وہ قربانی نہیں ہوتی' وہ اکثر و بیشتر ہماری کم ہمتی اور سہل پسندی کی سزا ہوتی ہے۔ یہ سزا پیار کرنے والوں کو جدا کر کے ان کی گردنوں میں جھوٹ اور منافقت کا طوق ڈال دیتی ہے اور تمام عمر انہیں دہری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کا روئے سخن میری طرف ہے۔" فرحین کے لہجے میں خشکی تھی۔

"ہرگز نہیں۔"

"تیمور صاحب!" فرحین بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں بولیں۔ "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اب اپنی باتوں سے آپ کو بہت بور کرنے لگی ہوں۔"

"ایسا آپ نے کیوں سوچا؟"

"آپ جب بھی اس متنازع موضوع کو چھیڑتے ہیں' مجھے ایسے ہی لگتا ہے۔"

"لیکن اس موضوع سے آپ کو اتنی چڑ کیوں ہے فرحین.......... کیا اپنی زندگی کے اہم ترین مسئلے پر بات کرنا گناہ ہے؟"

"بس آپ یہی سمجھ لیں کہ یہ میرے لئے بہت بڑا گناہ ہے۔"

"آپ بھول رہی ہیں کہ آپ مجھے دلیل سے بات کرنے کی تلقین کیا کرتی ہیں۔"

"گناہ کے لئے کوئی دلیل نہیں ہوتی تیمور صاحب!" حسب توقع فرحین کے لہجے میں غیریت عود کر آئی تھی۔

اس روز ہماری گفتگو کا اختتام بڑے مایوس کن انداز میں ہوا۔ خدا حافظ کہتے ہوئے فرحین کے لہجے میں جو بھاری پن تھا' وہ میں نے صاف محسوس کیا۔

میرا اپنا دل بھی فرحین کی مسلسل بے اعتنائی سے بھر سا آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں سالہا سال سے ایک دیوار کے ساتھ سر پھوڑ رہا ہوں۔ میرے قدم خودبخود اپنی خواب گاہ کی طرف اٹھ گئے۔ یہاں ایک الماری کے خفیہ خانے میں میرا چھوٹا سا بار روم موجود تھا۔ کبھی یہاں ہر قسم کی قیمتی شرابیں سجی رہتی تھیں مگر اب اس خفیہ خانے کی رونق' نہ ہونے

کے برابر رہ گئی تھی۔ وہسکی کی دو بوتلیں اور بیئر کے چند ٹن موجود تھے۔ سینے میں جلتی ہوئی آگ کو سرد کرنے کے لئے میں نے ملازم دین محمد کو بلایا اور کہا کہ وہ سوڈا اور برف لائے۔ وہ حیرت اور قدرے دکھ سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اس امر کی خوشی تھی کہ میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ شراب تو دور کی بات تھی' سگریٹ بھی اب کم کم ہی میرے ہاتھ میں نظر آتا تھا۔ جمعے کی نماز میں باقاعدگی سے ادا کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ اس نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے میرے لئے پینے کے لوازمات رکھ دیئے۔ وہ بہت غم زدہ تھا لیکن جلد ہی اس کا یہ غم مسرت وشادمانی میں بدل گیا۔ میں نے نہ صرف پینے پلانے کے لوازمات اٹھوا دیئے بلکہ دین محمد کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ الماری میں موجود تمام شراب گٹر میں بہادے اور بوتلیں توڑ پھوڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دے۔

اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب کسی برائی کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم فرحین کے نیک تصور نے روک لئے تھے۔ وہ اپنی شخصیت کی تمام تر خوبصورت توانائی کے ساتھ میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی اور مجھے واپس لوٹا دیا تھا۔

پورے چاند کی وہ ساری رات میں نے اپنی کوٹھی کی چھت پر ٹہلتے اور فرحین کے بارے میں سوچتے گزاری۔

یہ یقین کسی الہام کی طرح میرے سینے میں اترا ہوا تھا کہ فرحین کے دل میں میرے لئے جگہ موجود ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے دل کے راز کو زبان تک لانا تو درکنار آنکھوں تک بھی نہیں آنے دیں گی.......... وہی خود کو قربان کرنے اور اپنے جذبات کا گلا گھونٹنے والا جذبہ' جس سے اب مجھے چڑ ہو گئی تھی' یہی خود اذیتی کا رویہ تو تھا جس کے چنگل سے میں فرحین کو چھڑانا چاہتا تھا مگر وہ اس میں مزید گرفتار ہو رہی تھیں۔ اپنے مشرقی ادب اور شاعری کی روتی بسورتی اور "قربانیاں" دیتی ہیروئن سے مجھے ہمیشہ الرجی رہی تھی۔ مجھے تو وہ فلمیں اور ڈرامے بھی زہر لگتے تھے جن میں نوجوان خواتین و حضرات عشق پیچھے کہیں اور لگاتے ہیں اور شادیاں کہیں اور کرتے ہیں۔ پھر منافقت اور بددیانتی کا ایک طویل دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں چھپ چھپ کر رویا جاتا ہے۔ المیہ

غزلیں اور گیت سنے جاتے ہیں' چپکے چپکے ان مواقع کا انتظار کیا جاتا ہے' جب اپنے ممدوح کا دیدار نصیب ہو یا اس کی آواز کانوں میں پڑے۔ محبت جیسے عظیم جذبے کے بارے میں میرے خیالات وہی تھے جو شاید کبھی میری والدہ کے رہے تھے۔ ان کے نزدیک محبت ایک سچ تھا اور سچ چھپانے والی یا ضائع کرنے والی چیز نہیں ہوتا۔ سچ کو پانے کی کوشش کرنی چاہئے' اپنی پوری جسمانی اور روحانی توانائیوں کے ساتھ............ اس کو پالینا چاہئے یا پھر خود مٹ جانا چاہئے۔ اگر کوئی شخص سچ یعنی محبت کو پا نہ سکے اور اس سے محروم ہو کر خود کو مٹا بھی نہ سکے تو پھر وہ یقین کرلے کہ جسے وہ سچ سمجھتا تھا' وہ سچ نہیں تھا پھر اسے بھول جائے۔ دل کی کتاب سے اس ورق کو یوں پھاڑے کہ اس کا نام ونشان باقی نہ رہے۔ اپنے اور اپنے اس ممدوح کے درمیان اتنا ہی فاصلہ پیدا کرلے جتنا ایک زندہ اور مردہ شخص میں ہوتا ہے۔

میرے اندیشے کے عین مطابق اس گفتگو کے بعد کئی ہفتے تک فرحین کا فون نہیں آیا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ جب بھی رابطہ کرنا ہوگا فرحین ہی فون کریں گی۔ میرے پاس ان کا نمبر موجود تھا لیکن میں معاہدے کی رو سے انہیں فون نہیں کرسکتا تھا۔ آخر کافی انتظار کے بعد ایک روز میں نے رات کو انہیں رنگ کیا۔ دوسری طرف سے تائی کی آواز آئی' میں نے فون بند کردیا۔ رات گئے دوبارہ رنگ کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب فرحین مجھے فون کیا کرتی تھیں' مجھے امید تھی کہ وہ فون اٹھائیں گی لیکن اس مرتبہ بھی تائی ہی کی خوابیدہ آواز سنائی دی تھی۔ اگلے روز میں نے دو تین بار کوشش کی۔ ایک دفعہ عینی اور دو دفعہ تائی نے فون اٹھایا۔ مجھے یوں لگا جیسے فرحین نے فون اٹھانا ہی چھوڑ دیا ہے۔

میرے دل ودماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں فرحین کو اس کے خول سے نکالنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ذرا سی بھی کوشش نہیں کر رہی تھیں بلکہ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ مزید خول اپنے اوپر چڑھا رہی ہیں۔ ایک روز میں نے ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے دو دن تک وقفے وقفے سے انہیں کئی بار فون کیا۔ آخر ایک بار فرحین نے فون اٹھا ہی لیا۔

"کہیں فون تو بند نہیں کردیں گی؟" میں نے ہیلو کہنے کے بعد فوراً جملہ بول دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر ان کی جلترنگ سی آواز ابھری۔ "نہیں' ایسی بات تو

نہیں۔"

"کیا ناراض ہیں مجھ سے؟"

"نہیں۔ بس یونہی پچھلے دنوں کچھ مصروف رہی۔ دونوں ملازمائیں بھی چھٹی پر چلی گئی تھیں۔ گھر کا کام کاج بھی خود کرنا پڑ رہا تھا............ آپ سنائیں' کیسے ہیں؟"

"کیسا ہو سکتا ہوں؟"

"مجھے معلوم ہے کہ میرے فون نہ کرنے سے آپ کو پریشانی ہوئی ہوگی۔ مگر میرا خیال ہے کہ اب یہ فون ہماری عادت بنتا جارہا تھا اور یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی۔"

"آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب آپ یہ معمولی سا رابطہ بھی ختم کرنا چاہ رہی ہیں۔"

"نہیں' ایسی بات تو نہیں۔ کبھی کبھی کیا کروں گی فون۔"

"چھ مہینے بعد یا سال بعد؟"

"نہیں' اتنا لمبا وقفہ تو نہیں ہوگا............ اور اگر ہو بھی جائے تو آپ یہی سمجھئے گا کہ کوئی مجبوری رہی ہوگی۔"

فرحین کے لہجے میں اجنبیت کی لہر میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "آپ نے یہ نہیں پوچھا' میں نے فون کیوں کیا؟"

"اب پوچھ لیتی ہوں۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا اور فرحین سے ملنے کے لئے کوئی معقول جواز ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھیں' آپ مجھے یوں راہ میں نہیں چھوڑ سکتیں۔ آپ کی وجہ سے میری زندگی میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ کم از کم تبدیلیوں کا یہ عمل تو مکمل ہولینے دیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ یہ عمل خود سے بھی مکمل کرسکتے ہیں۔"

"مگر رہنما کے بغیر تو راستہ ہاتھ نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے جو کتابیں مجھے بھیجی تھیں' وہ میں نے دوبارہ پوری تفصیل سے پڑھی ہیں۔ کچھ سوال ہیں جو میرے ذہن میں بار بار ابھر رہے ہیں۔ میں نے انہیں علیحدہ سے نوٹ کیا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ایک بار آپ سے ان سوالوں پر تھوڑی سی بات کروں۔"

میں نے فرحین کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری کوئی اور بات سنجیدگی سے سنیں‘ نہ سنیں‘ وہ بات ضرور سنیں گی جو میری اصلاح کے حوالے سے ہوگی۔ لائن پر دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر فرحین کی آواز آئی۔

"اچھا.......... میں.......... آپ کو رات میں فون کروں گی۔"

"فون پر نہیں.......... آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں گے۔ اپنے مصروف وقت میں سے ایک آدھ گھنٹا مجھے بھی عنایت کردیں۔ آپ نازلی کو گاڑی پر کالج لینے جاتی ہیں۔ راستے میں ہی وہ ریسٹورنٹ ہے جہاں ہم پہلے بھی بیٹھے تھے۔ کل دوپہر ایک آدھ گھنٹا پہلے نکل آیئے گا۔ چائے پی لیں گے اور چند باتیں کرلیں گے۔"

"نہیں تیمور صاحب!" فرحین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ پہلے بھی اس طرح آپ سے مل کر میں نے غلطی کی تھی‘ یہ کسی طور مناسب نہیں ہے۔"

میرے اصرار کے باوجود فرحین ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ آخر میں نے کہا "فرحین! اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ سے چند نہایت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور یہ وعدہ بھی کروں کہ اس کے بعد آئندہ کبھی بھی آپ کو ایسی زحمت نہیں دوں گا تو پھر..........؟" دوسری جانب سے فوری جواب نہیں ملا۔ میں نے کہا۔ "فرحین‘ اگر آپ مجھ پر ذرا بھی بھروسا رکھتی ہیں تو انکار نہ کریں۔ سمجھیں یہ میری آخری خواہش ہے۔"

دوسری طرف خاموشی تھی۔ غالباً وہ تذبذب میں تھیں۔ ایک جاں گسل انتظار کے بعد ان کی آواز آئی۔ "اچھا‘ میں پھر فون کروں گی۔"

"پلیز فرحین! مجھے انتظار کی سولی پر مت لٹکائیں۔ آپ نے کسی سے مشورہ تو نہیں کرنا۔ آپ نے جو کہنا ہے ابھی کہہ سکتی ہیں۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے کہا۔ "اگر آپ مجھے دوبارہ مجبور نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں تو میں آجاؤں گی۔"

☆======☆======☆

ہم شیزان ریسٹورنٹ کے ہال میں ایک پُرسکون میز کے گرد بیٹھے تھے۔ فرحین ہمیشہ کی طرح سادہ لیکن حسین اور پُروقار دکھائی دے رہی تھیں۔ دوپٹا مضبوطی سے ان کے سر پر جما ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے فرحین کو یہ بتایا کہ کتابوں سے اٹھنے والے سوالات

کے بارے میں‘ میں نے جو بات کہی تھی‘ وہ غلط تھی۔ ایسا میں نے صرف فرحین سے ملاقات کے لئے کہا تھا۔

فرحین کے ماتھے پر ناگواری کی شکن نظر آئی مگر میرے اندازے کے مطابق وہ اس بات پر خوش بھی تھیں کہ میں نے اپنے جھوٹ کو طول نہیں دیا۔

میں نے کہا۔ "فرحین صاحبہ! سب سے پہلی بات تو آپ کو یہ سننا پڑے گی کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کا رویہ آئندہ چاہے کچھ بھی ہو‘ میرا رویہ تبدیل نہیں ہوگا۔ کیا آپ سن رہی ہیں؟"

فرحین میز کی سطح کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اثبات میں سرہلایا۔

میں نے کہا۔ "فرحین صاحبہ! ممکن ہے کہ آپ میری اس بات کو رسمی سمجھیں یا پھر خوشامد کے طور پر لیں لیکن یہ سوفیصد حقیقت ہے کہ آپ کو جاننے کے بعد میرے اندر بے شمار تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس روز ہم دونوں نے راولپنڈی میں پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا‘ ہم دو انتہاؤں پر تھے‘ دو بالکل مختلف شخصیات تھیں ہماری.......... آپ میں نرمی تھی‘ تہذیب تھی‘ خداترسی اور محبت تھی‘ سب سے بڑھ کر یہ کہ سماجی روایات کی پاسداری تھی۔ مجھ میں کرختگی تھی‘ آوارگی تھی‘ پھکڑپن تھا اور وہ جو عرف عام میں کہا جاتا ہے چاروں شرعی عیب موجود تھے۔ ہم دو انتہاؤں پر تھے اور میں آپ کے قریب آنا چاہتا تھا۔ شاید یہی وہ خواہش تھی جس نے لاشعوری طور پر مجھے تبدیل کرنا شروع کیا۔ میں اپنی انتہا سے ہٹ کر آہستہ آہستہ لیکن بتدریج آپ کی طرف کھنچتا چلا گیا اور یہ سب کچھ ایسے خود کار طریقے سے ہوا کہ مجھے خود بھی علم نہیں ہوسکا۔ مگر دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ آپ نے اپنی جگہ سے ایک ملی میٹر بھی جنبش نہیں کی۔ ایک معمولی سی گنجائش بھی آپ میرے لئے نہیں نکال سکیں۔ حالانکہ آپ اپنے اچھے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ایسا کربھی سکتی تھیں اور آپ کو کرنا بھی چاہئے تھا۔ ایک شخص جو برائی کی دلدل سے نکل رہا ہو اور سہارے کے لئے آپ کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو تو کیا آپ اس کی مدد پر قادر ہونے کے باوجود اپنی جگہ ساکت کھڑے رہیں گے۔ میرے خیال میں آپ جیسا مہربان اور ہمدرد شخص تو ایسا نہیں کرسکتا لیکن آپ نے ایسا کیا ہے اور اب بھی کررہی ہیں۔ آپ اپنی انتہا سے معمولی سی بھی حرکت کریں تو ہم باہم مل سکتے ہیں۔

لیکن آپ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ اپنے آپ سے جنگ لڑنے والا ایک ہانپتا کانپتا شخص لڑائی کے آخری مرحلے میں مدد طلب نظروں سے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے اور آپ اپنی جگہ پتھر کا بت بنی کھڑی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اب آپ اسے واپس دلدل میں دھکیلنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

فرحین نے کہا۔ "انسان کو اپنے حالات سے نکلنے کے لئے خود ہی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ کوئی دوسرا تحریک تو دے سکتا ہے لیکن اصل ارادہ تو اپنا ہی ہوتا ہے۔ باقی میں نے آپ سے کبھی بھی کسی قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ آپ مجھے اس سلسلے میں مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔"

"وعدہ زبان سے کرنا ضروری نہیں ہوتا۔" میں نے بے باک لہجے میں کہا۔ "اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آپ نے وعدے کئے ہیں۔"

"میں خواب میں بھی کوئی ایسی بات نہیں سوچ سکتی تیمور صاحب! آپ نے اپنے دماغ میں میرے متعلق غلط فہمیاں پال رکھی ہیں۔"

"اچھا' آپ یہ بتائیں آپ خواب میں بھی کوئی ایسی بات کیوں نہیں سوچ سکتیں؟"

"آپ پھر ذاتیات پر آ رہے ہیں۔"

"دیکھیں فرحین صاحبہ! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ آج آخری بار آپ مجھ سے سب کچھ سنیں گی۔ پلیز! مجھے اپنی بات کا جواب چاہئے۔ اپنے دل کی گہرائی میں جھانک کر بتائیں' آپ ایسا کیوں نہیں سوچ سکتیں؟"

"آپ......... آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں......... شادی شدہ ہوں۔"

"شادی کا لفظی مطلب سمجھتی ہیں آپ؟" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے بتائیں' پچھلے آٹھ سالوں میں اس ناتے سے کتنی خوشی ملی ہے آپ کو......... کتنی مسرتیں سمیٹی ہیں آپ نے؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"لیکن میرے بھی کچھ ذاتی معاملات ہیں اور میں ان پر بات کر سکتا ہوں۔"

"میرے معاملے سے آپ کے معاملے کا کوئی تعلق نہیں۔"

"ہے فرحین! اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ آج کی ملاقات ہماری آخری ملاقات ثابت ہو لہٰذا آج میں آپ کو ناراض کرنے کا خطرہ بھی مول لے لوں گا۔ گستاخی معاف' جسے آپ شادی کہہ رہی ہیں وہ ایک ایسی زنجیر ہے جس کا ایک سرا آپ کے پاؤں میں ہے لیکن دوسرا سرا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ آپ اس دوسرے سرے کو خود ہی مختلف چیزوں کے ساتھ باندھتی پھر رہی ہیں۔ کبھی سسر کے ساتھ' کبھی ساس کے ساتھ' کبھی نندوں اور دیوروں کے ساتھ۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ آپ حماقت کر رہی ہیں لیکن وہ آپ کو منع کیوں کریں گے؟ اس میں ان کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ آپ ان کے بچے کو پڑھا دیتی ہیں' ان کا کچن سنبھال لیتی ہیں۔ ان کی مٹھی چاپی کر دیتی ہیں۔ اپنے زعم میں آپ بڑا تیر چلا رہی ہیں مگر آپ کچھ نہیں کر رہیں' صرف ضائع کر رہی ہیں خود کو......... جو کچھ آپ اس گھر میں کر رہی ہیں وہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار لینے والی ایک آیا بھی بخوبی کر سکتی ہے۔ بچے کے لئے ٹیوٹر بھی ہزار دو ہزار میں مل جاتا ہے۔ آپ......... آپ اس زنجیر کو کیوں جگہ جگہ باندھتی پھر رہی ہیں؟ کیوں اسے اتار کر پھینک نہیں دیتیں۔ آپ کا مذہب' آپ کے حالات' آپ کے اپنے لوگ' سب اس کو اتار پھینکنے کے حق میں ہیں۔"

فرحین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا' انہوں نے کہا۔ "مسٹر تیمور! برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔"

"آج میں یہ حد دیکھ لینا چاہتا ہوں۔" میں نے بلا توقف کہا۔ "آپ کے شوہر نے کئی برس سے آپ کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ صاف الفاظ میں کہہ چکا ہے کہ وہ آپ کو Divorce کرنا چاہتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق پچھلے آٹھ برس میں اس نے کوئی ایک اشارہ ایسا نہیں دیا جس سے آپ کو یہ خوش فہمی ہو سکے کہ وہ آپ کو دوبارہ بسا لے گا۔ پھر آپ اپنا حق کیوں استعمال نہیں کرتی ہیں۔ کیوں اس شخص کی زندگی سے نہیں نکل جاتیں جس نے آپ کو اپنی زندگی سے مکھن کے بال کی طرح نکال پھینکا ہے؟"

"مسٹر تیمور' آپ........."

"آپ مجھے کہنے دیجئے۔" میں نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔ "لیجئے' آج میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کیوں اس گھر کی دہلیز پر پڑی ہوئی ہیں۔ آپ نے بہت نفسیات اور عمرانیات پڑھی ہے۔ فارغ بیٹھ کر بڑا غور کیا ہے زندگی کے فلسفوں پر......... لیکن تھوڑا

بہت میں بھی جانتا ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ اور آپ جیسی ہزاروں لاکھوں دوسری پابہ زنجیر خواتین کا اصل مسئلہ کیا ہوتا ہے۔ آپ کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آپ کم حوصلہ اور سہل پسند ہیں اور ان کمزوریوں کے سبب آپ خود انحصاری سے دور ہیں۔ چونکہ آپ خود انحصار نہیں ہیں اس لئے معاشرہ ایک خوف بن کر آپ کے حواس پر مسلط ہوچکا ہے۔ آپ ایک معمولی سا قدم اٹھانے سے پہلے بھی خوف زدہ نظروں سے معاشرے کی طرف دیکھنا ضروری خیال کرتی ہیں۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے' ڈگریاں لی ہیں لیکن بے عملی اور سہل پسندی کا گھن آپ کی صلاحیتوں کو چاٹ گیا ہے۔ معاف کیجئے گا' میرے لفظ بڑے سخت ہیں لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کے پاؤں میں جو زنجیر ہے اس کا لوہا آپ کی آرام طلبی اور کم ہمتی کے کیمیائی عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اپنی نندوں کو ہوم ورک کرالینے' ہانڈی میں ڈوئی پھیر لینے اور کسی وقت چند روٹیاں اتار لینے کو آپ نے اپنا مصرف سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ آپ کا مصرف یہ نہیں ہے اور اپنے مصرف اور مقصد کو نہ پہچاننے کی سزا یہ ہے کہ حالات نے آپ کی آنکھوں میں ایک خوف زدہ ہرنی کی پتلیاں فٹ کردی ہیں اور آپ مظلوم ہونے کے باوجود مجرم کی طرح بدکی پھرتی ہیں۔"

"مسٹر تیمور!"

فرحین کا سراپا کانپ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ فرطِ غضب سے مجھ پر برس پڑیں گی لیکن پھر انہوں نے بمشکل خود پر قابو پایا اور چند گہرے سانس لے کر بولیں۔ "تیمور صاحب! شاید آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ چار دیواری کے اندر رہ کر گھر سنبھالنا اور دیگر گھریلو ذمے داریاں پوری کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

"بالکل معنی رکھتا ہے لیکن ہر فرد کو اپنی خداداد قابلیت کے مطابق کام کرنا چاہئے اور وہ آپ نہیں کر رہیں اور میرا خیال ہے کہ اب آپ کر بھی نہیں سکتیں۔ آپ نے اپنے چاروں طرف آسانیوں کی دیواریں کھڑی کرلی ہیں اور اس قفس کو ہی زندگی سمجھ لیا ہے' اب آپ اڑنے کی کوشش بھی کریں گی تو نہیں اڑ سکیں گی۔ زمین پر ہی پڑی پھڑپھڑاتی رہ جائیں گی۔"

میرا لہجہ تلخ سے تلخ ہو رہا تھا میں نے اس تلخی پر قابو پانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

میں چاہتا تھا کہ آج جو کچھ بھی میرے دل میں ہے' سچے کھرے انداز میں فرحین کے کانوں تک پہنچ جائے۔

"آپ یہ باتیں اس لئے کہہ رہے ہیں کہ آپ مرد ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ جب ایک عورت گھر کی چار دیواری سے نکلتی ہے تو اسے کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاشرہ اسے کس آزمائش سے دوچار کرتا ہے۔"

"اور یہ وہی عقل کا اندھا معاشرہ ہے نا' جس کی ناراضگی کے خوف سے بے شمار مشرقی عورتیں ساری زندگی زانی شرابی شوہر کے پاؤں کی جوتی بنی رہتی ہیں۔ اس کے مخدوش مستقبل والے بچے پیدا کرنا قبول کرلیتی ہیں مگر اس سے علیحدگی کے بارے میں سوچتی بھی نہیں۔ یا اس ظالم معاشرے کو ناقابلِ قبول کہیں یا اس سے خوف نہ کھائیں.......... آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ چار دیواری سے باہر عورت کے لئے مسئلے ہیں مگر باہمت اور باحیا عورت کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھتی تھی کہ آپ اس قدر سطحی انداز میں سوچتے ہیں۔"

"آپ کے سوچنے کا جو غیر سطحی انداز ہے' اسے بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ فرحین صاحبہ' آپ اپنے زعم میں قربانیاں دیتی ہیں۔ جسے میں نے سہل پسندی کہا ہے اسے آپ ایثار قرار دیں گی اور کہیں گی کہ ایک گھر کو بنانے کے لئے آپ نے اپنی صلاحیتوں کو طاق پر رکھا ہے۔ اس طرح کا دوسرا ایثار آپ اپنے شوہر کے لئے کر رہی ہیں اور اس کے حق میں بیٹھی ہوئی ہیں بلکہ لمبی تان کر سوئی ہوئی ہیں۔ اسی طرح کی ایک سو ایک قربانیاں آپ نے تمغوں کی طرح سینے پر سجا رکھی ہیں.......... اور ان میں سے ایک قربانی وہ دم توڑتا تعلق بھی ہے جو میرے اور آپ کے درمیان موجود ہے۔"

"کون سا تعلق.......... کیسا تعلق؟"

"انجان مت بنئے آپ۔" میں نے بدستور تیز لہجے میں کہا۔ "آپ پوری طرح آگاہ ہیں۔ اب پچھلے کچھ عرصے سے آپ نے اس معصوم تعلق کو بھی قربان گاہ پر لٹایا ہوا ہے اور کند چھری سے اسے ذبح کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بے چارے نے ذبح ہی ہونا ہے۔ اس کے ذبح ہونے کے بعد آپ اپنے سینے پر نیکی اور قربانی کا ایک اور تمغا سجالیں گی لیکن یہ تمغا بھی درحقیقت اسی منحوس زنجیر کے لوہے سے ڈھلا ہوگا جو

آپ کی بے عملی اور سہل پسندی کے باعث آپ کے پاؤں میں پڑی ہے۔"

"آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں مسٹر تیمور!" فرحین غرائیں۔ "میں جارہی ہوں اور آئندہ آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہوں گی۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میں نے بے خوفی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ نہیں جاسکتیں۔ آپ کو میری پوری بات سننا ہوگی.......... بیٹھ جائیے۔" میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

ان کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نظر آئی۔ ہاتھ بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ شدید تذبذب میں انہوں نے دائیں بائیں دیکھا اور دھم سے بیٹھ گئیں۔

"اِٹ اِز ٹو مچ مسٹر تیمور!" انہوں نے غضب ناک سرگوشی کی۔ "میرا ہاتھ چھوڑیئے ورنہ میں بلند آواز میں بولوں گی۔"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "آپ کچھ نہیں کرسکتیں مسز فرحین! کیونکہ یہاں بھی آپ کی سہل پسندی اور کم ہمتی آڑے آئے گی۔ ویسے میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہوں لیکن آپ کو میری پوری بات سن کر جانا ہوگا۔" میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

انہوں نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا اور اوڑھنی کو مضبوطی سے سر پر جمالیا۔

میں نے کہا۔ مسز فرحین! آپ نے مجھے بہت سے مشورے دیئے تھے۔ آج میں بھی آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں۔ اپنے آپ کو ٹٹولئے اور کچھ نہیں تو اپنے مذہب ہی کے حوالے سے دیکھئے‘ ہمارا دین ہمیں عمل اور جدوجہد کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ اپنی جان کو سکھی کرنے کے لئے ہم خود پر خود ساختہ پابندیاں لگائیں اور تارک الدنیا ہوکر بیٹھ جائیں.......... اپنی زندگی کو رُکے ہوئے پانی کا جوہڑ بنالیں.......... پھر اسی جمود اور ٹھہراؤ کو اپنی قربانی اور ایثار سے تعبیر کرتے پھریں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں‘ آپ نے کوئی قربانی نہیں دی اور نہ دے رہی ہیں۔ آپ صرف.......... معاف کیجئے گا.......... اپنی کاہلی اور کم کوشی کو قربانیوں کا نام دے رہی ہیں۔ فطرت کے بہتے گنگناتے‘ شفاف پانی جیسے دھارے کو جوہڑ میں بدل کر زندگی کی ناقدری کر رہی ہیں اور کفرانِ نعمت کی مرتکب ہورہی ہیں۔"

میرا لہجہ بے رحم ہوتا چلا جارہا تھا۔ الفاظ کے نشتر تیز تر ہوگئے تھے۔ فرحین بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ آخر وہ چیخ پڑیں۔ "مسٹر تیمور! آپ کیا سمجھتے ہیں اپنے

آپ کو۔ کوئی نفسیات دان ہیں آپ؟ یا بہت بڑے عالم دین ہیں یا کسی شعبے میں کوئی بہت سنہری کارنامہ انجام دیا ہے آپ نے؟ کیا ہیں آپ؟ کیا کرائے ٹیریا ہے آپ کا؟ اور آپ مجھے سبق پڑھا رہے ہیں‘ مجھے اسکول کی بچی سمجھ رکھا ہے آپ نے؟ جسے آپ کے بزرگانہ لیکچر کی ضرورت ہے..........؟ کس ہوا میں ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوا میں ہوں۔"

"آپ کا.......... دماغ چل گیا ہے۔" وہ ایک بار پھر جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میں نے اس مرتبہ انہیں نہیں روکا۔

اطمینان بھرے لہجے میں‘ میں نے کہا۔ "اگر میرا دماغ چل گیا ہے تو آج جو باتیں میں نے کہی ہیں‘ ان میں سے کسی ایک بات کو ہی غلط ثابت کرکے دکھا دیجئے گا اور اگر نہ دکھا سکیں تو پھر اکیلے میں بیٹھ کر ندامت کا تھوڑا سا پسینہ ضرور بہالیجئے گا۔"

وہ سرتاپا کانپ رہی تھیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگایا۔ انہوں نے جھٹکے سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں۔

☆======☆======☆

کئی ہفتے گزر گئے۔ مجھے فرحین کی خبر ملی اور نہ ان تک میری خبر پہنچی۔ روز و شب میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ وہی لگی بندھی بیزار کن مصروفیات تھیں۔ صبح آفس پہنچنا‘ پانچ بجے چھٹی کرنا‘ اکثر بغیر کسی دوست کے شاہراہ قائداعظم پر گھومتے رہنا یا کسی باغیچے میں بیٹھ جانا اور نومبر کی یخ بستہ تاریکی کو دم بدم سبزے پر اترتے دیکھنا "کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں" والا معاملہ تھا۔ رات نو دس بجے کے لگ بھگ میں گھر پہنچتا تھا۔ ہرگز امید نہیں تھی کہ فرحین کا فون آئے گا پھر بھی میں متوقع نظروں سے ملازم دین محمد اور آیا کی صورت تکتا‘ یہ تمنا رکھتا کہ شاید ان کے ہونٹ اس انداز میں جنبش کریں کہ میرے کانوں کی قسمت جاگ جائے۔ کھانے کے بعد میں خالی خالی کمروں میں اداس پھرتا۔ وہ کھڑکی کھول کر بیٹھ جاتا جس کا رخ فرحین کے گھر کی طرف تھا۔ ہوا کی سرگوشیاں سنتا‘ اگر کبھی فون کی گھنٹی بجتی تو سر سے پاؤں تک ہل جاتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ فرحین کا فون نہیں ہوگا۔ اسی امید پر فون اٹھاتا کہ یہ فرحین کا فون ہوگا۔ کسی وقت کمرا بند کرکے بیٹھ جاتا اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ میں ان کم نصیب لوگوں میں سے ہوں جو

عشق میں چوٹ کھاتے ہیں اور پھر ساری زندگی کراہتے رہتے ہیں۔ ذہن میں سوال اٹھتا۔ مجھ سے ایسا کیوں ہوا؟ کیا میرے گرد لڑکیوں اور رشتوں کی کمی تھی؟ میری نظرِانتخاب فرحین پر کیوں پڑی؟ ایسا راستہ کیوں چنا میں نے جس پر خار ہی خار تھے اور منزل کا دور تک سراغ نہ تھا۔ زندگی میں ایسی کیا غلطی ہوئی تھی مجھ سے جس کی ایسی جان لیوا سزا مل رہی ہے مجھے۔ ان سوالوں کا ایک ہی جواب تھا بقول غالب ؏

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

پھر ایک روز مجھے ایک عجیب خبر ملی۔ اخلاق اور نرگس میرے گھر آئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ فرحین نے لاہور کی سب سے بہترین کمپیوٹر یونیورسٹی بطور ٹیچر جوائن کرلی ہے۔ اب وہ ہر روز باقاعدگی سے اپنی گاڑی پر آفس جاتی ہیں۔

یہ حیران کن اطلاع تھی۔ اخلاق اور نرگس بھی حیران نظر آرہے تھے۔ میں بھی حیران تھا لیکن میری حیرانی کے پیچھے خوشی کی ایک بلند وبالا لہر بھی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اس ناقابلِ شکست خول کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوگیا ہوں جو فرحین نے برسوں سے اپنی ذات پر چڑھا رکھا تھا۔ اس خول کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا ہی تھا جو فرحین اپنی صلاحیتوں کو آزمانے نکلی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ پودوں کو پانی دینے' ہانڈی میں ڈوئی چلانے اور نندوں کو ہوم ورک کرانے سے آگے کچھ سوچ ہی نہ پاتی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ اس روز اپنے دل پر پتھر رکھ کر میں نے فرحین کے ساتھ جس لب ولہجے میں بات کی تھی اور تند وتیز رویہ اپنایا تھا' وہ رائیگاں نہیں گیا تھا۔ میرے تابڑ توڑ پھینکے ہوئے کنکروں نے فرحین کی ذات کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ہلچل پیدا کردی تھی اور یہی میں چاہتا تھا.......... یہی میری خواہش تھی۔

میرے دل کے کوہ ندا سے ایک آواز گونج بن کر ابھری۔ کچھ ہونے والا ہے.......... کچھ.......... ایسا ہونے والا ہے جو گردوپیش کے ہر منظر کو بدل ڈالے گا۔ مگر یہ کیا ہوگا؟ کب اور کیسے ہوگا؟ اس کا کچھ علم نہیں تھا.......... پھر پانچ چھ ہفتے بعد مجھے اخلاق ہی کی زبانی پتا چلا کہ بطور ٹیچر فرحین کی ترقی ہوگئی ہے.......... اور انہیں ادارے کی طرف سے رہائش کی سہولت بھی ملی ہے۔ فرحین کے والدین گجرات میں اپنے سب سے

چھوٹے بیٹے کے پاس مقیم تھے۔ فرحین نے اپنے بھائی اور والدین کو لاہور بلالیا تھا۔ ادارے کی طرف سے جو رہائش گاہ فرحین کو ملی تھی' وہ لوگ اس میں رہنے لگے تھے۔ تاہم فرحین اپنے سسرال میں ہی قیام پذیر تھیں۔

☆------☆------☆

تین چار ماہ مزید گزر گئے۔ میں فرحین کی طرف سے کسی رابطے کا منتظر رہا۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اب رابطہ نہیں کریں گی۔ انا کی غیر مرئی لیکن بڑی مضبوط دیوار ہمارے درمیان حائل ہوچکی تھی۔ اس دیوار کو توڑنا ہم دونوں کے لئے مشکل تھا اور میرے خیال میں فرحین کے لئے زیادہ مشکل تھا۔ لیکن محبت تو کسی مشکل کو نہیں مانتی اور دل کے اپنے ہی موسم ہوتے ہیں۔ ان موسموں میں انتظار کا موسم سب سے پائیدار اور طویل ہوتا ہے۔ میرے دل میں بھی یہ موسم اپنے جوبن پر تھا۔ ہر صبح امید بندھتی اور ہر شام آس ٹوٹ جاتی تھی۔ بے چین راتوں میں' میں پہروں فون سیٹ کو گھورتا رہتا یا باغیچے میں ٹہلتا رہتا.......... ایک بار پھر موسم گرما شروع ہوچکا تھا۔ میں اپنے دل کی بے کلی کو لے کر انہی محبوب وادیوں میں چلا گیا جنہوں نے ہمیشہ مجھے گلے لگایا تھا۔ میرے پیارے شمالی علاقہ جات.......... جن کے کوہ ودمن میں میری تنہائی ہواؤں میں تحلیل ہوجاتی تھی۔ وہ خوبصورت نظارے میرے ہمراز تھے۔ ہم خاموشی کی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے' ایک دوسرے کے دکھ بانٹتے تھے.......... اور اس مرتبہ تو ان نظاروں میں میرے لئے غیر معمولی کشش موجود تھی۔ یہی حسین نشیب وفراز تھے جہاں میرے دل کے اندر سچی محبت کی کلی کھلی تھی اور پھر خوشبوؤں اور رنگوں کا ایک جہاں آباد ہوا تھا۔ یہیں پر ناران سے جھیل سیف الملوک کی طرف جاتے ہوئے ایک خطرناک موڑ پر فرحین کی آنکھوں سے میری آنکھیں ملی تھیں اور ان لمحوں میں ہم دونوں ابن آدم اور بنت حوا کے سوا اور کچھ نہیں رہے تھے اور کائنات ہمارے لئے پھر سے تخلیق ہوئی تھی۔

میں ناران کی وادی میں گھومتا رہا اور ہر ہر قدم پر اپنی یادوں کو تازہ کرتا رہا۔ اس وقت کو آواز دیتا رہا جو ایک سال پہلے اس گلیشیر پر شوخ قہقہے بکھیرتا ہوا اور تیزی سے پھسلتا ہوا دیودار کے جنگل میں گم ہوگیا تھا.......... ایک روز ناران میں دریائے کنہار کے

کنارے گھومتے گھومتے اچانک میری نگاہ ساکت ہو کر رہ گئی۔ یوں لگا جیسے برسوں پہلے بالا کوٹ کی ایک مسجد کے وضو خانے میں رہ جانے والا ٹینس بال مجھے دوبارہ نظر آ گیا ہو یا وہ خوش رنگ چپل دوبارہ مل گئی ہو جو ایک روز ہمارے ہاتھوں سے پھسل کر دریائے کنہار میں جا گری تھی.......... میں نے خود سے چند میٹر کے فاصلے پر تین چار لڑکیوں کو دیکھا تھا اور ان میں سے ایک فوزیہ تھی۔ وہی فوزیہ جو ایک سال پہلے ہمارے گروپ میں شامل تھی اور ان وادیوں میں ہماری ہم سفر تھی۔ اس سفر کے حوالے سے میری کچھ تلخ یادوں کا تعلق فوزیہ سے تھا۔ شوگران کی وہ خوبصورت مگر تکلیف دہ رات مجھے بھولی نہیں تھی جب فوزیہ سے غنڈا گروپ کے لڑکوں نے دست درازی کی تھی اور اس دست درازی کا الزام کھٹاک سے مجھ پر لگا دیا گیا تھا۔ وہ ایک "یادگار" بے عزتی تھی جو میں نے فرحین اور اخلاق کی وجہ سے نہ جانے کیسے برداشت کر لی تھی۔ تاہم اس زخم کے نشان ابھی تک دل پر موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فوزیہ کو دیکھنے کے باوجود میں نے انجان ہی نظر آنے کی کوشش کی۔ وہ لڑکیوں کے گروپ سے علیحدہ ہو کر تیزی سے میری طرف چلی آئی۔

"السلام علیکم بھائی جان!" اس نے غیر متوقع طور پر بڑی اپنائیت سے کہا۔

"وعلیکم السلام، تم یہاں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ "میں یہاں اپنی یونیورسٹی کے گروپ کے ساتھ آئی ہوں۔ تیس چالیس لڑکیاں ہیں۔ آپ نے شاید ہماری بس پوسٹ آفس کے قریب کھڑی دیکھی ہو۔ ہم پچھلے دو روز سے یہاں ہیں، ابھی چار ایک دن مزید رہیں گے، پھر واپس لاہور روانہ ہو جائیں گے.......... ویسے آپ کے لئے ایک اچھی خبر ہے۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"اچھی خبر اور میرے لئے؟" میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیوں، آپ کے لئے کوئی اچھی خبر کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"اچھا، کیا خبر ہے؟"

"ایسے نہیں بتاؤں گی بھائی جان.......... ویسے آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتایا.......... وہ چہک کر بولی۔ "ہم بھی تو آپ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ چڑھائی کے بعد پہلے موڑ پر، وہ نیا دو منزلہ ہوٹل۔"

"بہت اچھی بات ہے لیکن.........."

"آپ اکیلے ہی ٹھہرے ہوئے ہیں؟" اس نے بات کاٹی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی۔ "ٹھیک ہے بھائی جان! میں آج شام آؤں گی آپ کی طرف.......... کمرا نمبر کیا ہے آپ کا؟" میں نے کمرا نمبر بتایا۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی پھر ساتھی لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس وقت یہ چڑیلیں ساتھ ہیں۔ میں شام کو چھ سوا چھ بجے آؤں گی آپ کی طرف۔ آپ ہوٹل میں ہی ہوں گے نا؟"

میں نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ اس نے بڑی اپنائیت سے خدا حافظ کہا اور چلی گئی۔ وہ کافی بدلی بدلی نظر آتی تھی، پہلے سے کچھ اسمارٹ بھی ہو گئی تھی۔

شام ٹھیک چھ بجے فوزیہ میرے ہوٹل پہنچ گئی۔ ہم نے کمرے کے سامنے برآمدے میں کرسیاں ڈال لیں۔ سامنے سبزہ زار تھا اور اس سے آگے دور ایک گلیشیر ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ناران کے جنریٹر آن ہو چکے تھے اور جگہ جگہ برقی قمقمے روشنی بکھیرنے لگے تھے۔ بڑا دلفریب منظر تھا۔ فوزیہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اب قدرے سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور چہرے پر شرمندگی سی جھلک رہی تھی۔ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "بھائی جان! سب سے پہلے تو میں اس واقعے پر آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں جو ایک سال پہلے شوگران میں پیش آیا تھا۔ یقین کریں جو کچھ میرے منہ سے نکلا اس میں میری کس بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔ میں اتنی حواس باختہ اور خوف زدہ تھی کہ جو کچھ ذہن میں آیا میں نے بول دیا۔ بعد میں، میں اپنی حماقت پر کتنا پچھتائی ہوں اور روئی ہوں میں بیان نہیں کر سکتی.......... آپ نے.........."

"پلیز فوزی! اب گزری باتوں کو رہنے دو۔ میں وہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔ کوئی شکایت نہیں ہے میرے دل میں۔ پلیز، تم بھی بھول جاؤ۔"

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کیا۔ فوزیہ بھی نارمل نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پھر ہلکی سی مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔ وہ بولی۔ "بھائی جان! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ فرحین باجی سے جتنی بے تکلف میں ہوں اور کوئی نہیں۔"

ایک سنسناہٹ سی میرے جسم میں دوڑ گئی لیکن میں نے اپنے تاثرات نارمل رکھے

"فرحین صاحبہ کا ذکر یہاں کیسے آ گیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے آ گیا کہ اسے آنا چاہئے۔" فوزیہ نے آنکھیں نچائیں۔ اس کا لب لہجہ چونکا دینے والا تھا۔

"تم پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔"

"ہے تو واقعی پہیلی!" وہ شوخ لہجے میں بولی۔ "جو کام برسوں میں نہ ہو سکا تھا' وہ چند ہفتوں میں ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں' جادو کا سر چڑھ کر بولنا۔"

"تمہارا اشارہ کس کام کی طرف ہے؟"

"فرحین باجی کی کایا پلٹ کی طرف۔ وہ اب باقاعدہ ایک ورکنگ وومین ہیں' بلکہ ورکنگ گرل کہنا چاہئے۔ لاہور میں کمپیوٹر میں بی سی ایس کرانے والے سب سے اچھے اور سب سے مہنگے ادارے میں پڑھا رہی ہیں۔ اپنے کام کو انجوائے کر رہی ہیں اور تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ حال ہی میں ان کی "آؤٹ آف ٹرن" ترقی ہوئی ہے۔"

"بھئی یہ تو اچھی بات ہے۔"

فوزیہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر شوخی مچلی۔ "اس اچھی بات کی' اچھی سی وجہ بھی میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

"کیا وجہ ہے؟"

"بتا دوں؟"

"ہاں بتاؤ۔"

"آپ ماریں گے تو نہیں؟"

"نہیں مارتا۔"

"یقین نہیں آتا۔"

"تم پریشان کر رہی ہو اب۔"

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "اس کی وجہ.......... صرف آپ ہیں بھائی جان.......... اور یہ بات میں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کے انکار سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ آپ ہی ہیں جن کے اکسانے پر فرحین باجی میں یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک طرح سے فرحین باجی نے آپ کے کہے کو

غلط ثابت کرنے کے لئے ہی یہ سب کچھ شروع کیا تھا۔ آپ میں اور ان کے درمیان چند ماہ پہلے شیزان ریسٹورنٹ میں جو باتیں ہوئی تھیں' انہوں نے باجی کو غم و غصے سے بھر دیا تھا۔ وہ دن رات پریشان و بے قرار رہی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے تایا جان سے مشورہ کیا تھا اور چند دن بعد سروس جوائن کر لی تھی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری عام سی باتوں کا وہ ایسا منہ توڑ جواب دیں گی۔"

"اب آپ نے خود ہی درست لفظ استعمال کر دیا ہے بھائی جان.......... سچ بات یہی ہے کہ وہ آپ کو منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھیں اور انہوں نے دیا ہے.......... لیکن اب.........." وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"اب کیا؟"

وہ تذبذب میں مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "بندے کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ کس کام کا کیا نتیجہ برآمد ہو جائے گا اور کون سا راستہ آگے جا کر کون سی منزل کی طرف جا نکلے گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ.......... باجی فرحین کے ساتھ بھی.......... کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں پھر شوخی چمک گئی' بولی۔ "کورس کی ایک انگریزی نظم میں' میں نے پڑھا تھا کہ پنجرے میں جوان ہونے والا پرندہ پنجرے کو ہی سارا جہان سمجھتا ہے' کسی اتفاق کے تحت جب وہ پنجرے سے نکلتا ہے تو اپنے سامنے زمین و آسمان کی وسعت دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے پر پھڑپھڑاتے ہیں اور اس کا دل اڑنے کو مچل جاتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر یہ پر کیوں ہیں.......... شاید باجی فرحین بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزری ہیں۔ تیمور بھائی جان! میں ان کے بہت قریب ہوں۔ باجی وہ باتیں بھی مجھ سے کہہ لیتی ہیں جو کسی اور سے نہیں کہتیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ پچھلے چند ماہ میں باجی کی سوچ میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ وہ اب اس انداز میں سوچنے لگی ہیں جس انداز میں انہیں سوچنا چاہئے تھا۔"

"کس انداز میں؟"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "شاید آپ کو معلوم نہیں۔ تین ماہ سے باجی اب علیحدہ گھر میں

رہ رہی ہیں۔ یہ رہائش ان کو اپنے ادارے کی طرف سے ملی ہے.......... باجی کی امی ابو اور چھوٹا بھائی پہلے ہی اس گھر میں رہ رہے تھے اب باجی بھی وہاں شفٹ ہو گئی ہیں۔ اور ایک دوسری اہم اطلاع یہ ہے کہ باجی نے اپنے شوہر نامدار کا دیرینہ مطالبہ پورا کر دیا ہے.......... انہوں نے Divorce لے لی ہے اور بھائی جان! سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری فیملی میں جو بھی باجی کے ساتھ مخلص تھا' وہ اس فیصلے سے خوش ہی ہوا ہے۔"

میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ دل سینے میں بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ فوزی کہہ رہی تھی۔ "فیملی میں سب جانتے تھے کہ باجی ایک لاحاصل انتظار کی تکلیف برداشت کر رہی ہیں۔ تایا کا نافرمان بیٹا نافرمان ہی رہے گا۔ وہ اب کبھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گا اور اگر کرے گا بھی تو باجی کو مزید زخمی کر کے چلا جائے گا۔ وہ سب جانتے ہیں کہ باجی اب ایک نسبتاً کامیاب اور پُرمسرت زندگی گزاریں گی.......... اور.........."

"اور کیا؟"

"اور ان سب سے زیادہ میں یہ بات جانتی ہوں۔" فوزیہ کی آنکھیں پھر شوخ ہو گئیں۔ میرا سانس سینے میں اٹکا ہوا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

چند لمحے قیامت خیز خاموشی میں گزرے پھر فوزیہ نے ایک گہری سنجیدہ سانس لی "تیمور بھائی!" وہ عجیب لہجے میں بولی۔ "باجی' آپ کو بہت مس کرتی ہیں۔ شاید آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنا مس کرتی ہیں۔ آپ کو ان کے دل کا کچھ پتہ نہیں ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ فوزیہ بھی چپ رہی۔ مگر سناٹا قیامت کا شور برپا کر رہا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے کہا۔

"میں سب جانتی ہوں تیمور بھائی..........!"

"مثلاً کیا؟"

"باقی باتیں باجی ہی سے پوچھ لیجئے گا۔ وہ ہمارے ساتھ یہاں موجود ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

وہ مسکرائی۔ "یہ ایک خوبصورت اتفاق ہے۔ جو تین ٹیچرز ہمارے ساتھ آئی ہیں' ان میں ہماری نئی اور ہردلعزیز "ٹیچر" مس فرحین شامل ہیں اور یہی وہ خوش خبری تھی

جناب عالی جو میں آپ کو سنانا چاہ رہی تھی۔"

میں اپنی جگہ سن بیٹھا رہ گیا۔

☆======☆======☆

وہ بڑی خوبصورت شام تھی۔ ہوٹل کی بالکونی میں سے دور وہ فلک بوس پہاڑ نظر آ رہے تھے جن کے اندر دنیا کا خوبصورت ترین پانی جھیل سیف الملوک کی شکل میں موجود تھا۔ سرخ کناروں والے بادلوں کے ٹکڑے اس پانی پر جھکے تھے' جیسے وہ بھی حیرت سے اس منظر کو تک رہے ہوں۔ دائیں طرف دریائے کنہار کا اچھلتا کودتا پانی چمک رہا تھا۔ اس کی لہریں چنچل بچوں جیسی تھیں۔ جیسی خوبصورت ماں (جھیل) ویسے خوبرو بچے۔

میں اس حسین گردوپیش میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ فوزیہ نے کل جو گفتگو کی تھی' اس کے کچھ حصے بار بار میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ فوزیہ نے کہا تھا۔ بندے کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ کس کام کا کون سا نتیجہ برآمد ہو جائے گا اور کون سا راستہ آگے جا کر کون سی منزل کی طرف جا نکلے گا۔ وہ یہ بات فرحین کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ فرحین کے حوالے سے میرا اندازہ بالکل درست نکلا ہے۔ چند ماہ پہلے میں نے شیزان ریسٹورنٹ میں فرحین سے نہایت تلخ ترش باتیں کی تھیں۔ اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ اگر فرحین نے میری اس تلخی ترشی کے نتیجے میں عملی زندگی میں قدم رکھ لیا تو پھر بات یہیں تک نہیں رہے گی.......... سوچ کا ایک وسیع و عریض آسمان فرحین کے سامنے کھلے گا اور انہیں احساس ہو گا کہ وہ زندگی جیسی عظیم نعمت کو کتنی بے رخی سے ضائع کر رہی ہیں۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ فوزی کی گفتگو سے آشکار ہو گیا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔

ناران کے مسکین صورت بچے میرے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ یہ لوگ حسین فطرت کے ایک عظیم خزانے کے مالک تھے' مگر روٹی کے ٹکڑوں کے لئے ترستے تھے۔ ایک عام سیاح کے لئے یہ لوگ حسین و جمیل پھولوں کے درمیان اگے ہوئے کانٹے تھے۔ سیاح ان کانٹوں سے ہاتھ بچا بچا کر پھول توڑتا تھا' خوشبو لیتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ میں نے ان بچوں میں کچھ ڈبل روٹی اور بسکٹ وغیرہ تقسیم کئے پھر میں نے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور انہیں تعلیم اور محنت کی عظمت کے بارے بتانے لگا۔ وہ ایک معصوم محویت کے ساتھ سنتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ چلے گئے تو میں نے چائے منگوائی اور سڑک کی طرف رخ کر کے بیٹھ

گیا۔ طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ دل کی دھڑکن باربار زیر وزبر ہوجاتی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے سامنے دیکھا تو آنکھوں کے نصیب جاگ اٹھے۔ فرحین اور فوزیہ میری طرف چلی آرہی تھیں۔ فوزیہ نے کھلتے رنگوں والے کپڑے پہن رکھے تھے' اوپر ایک شوخ سا سوئیٹر تھا۔ جبکہ فرحین ہمیشہ کی طرح چادر پوش نظر آرہی تھیں۔ کریم رنگ کی لیس دار چادر نے کندھوں سے نیچے نیچے انہیں لپیٹ رکھا تھا۔ سر پر سبز دوپٹا تھا۔ میں نے کھڑے ہوکر دونوں کا استقبال کیا۔ ہم میز کے گرد بیٹھ گئے۔ علیک سلیک کے بعد رسمی کلمات ادا کئے گئے پھر کافی آگئی۔ سبز دوپٹے کے گھیرے میں فرحین کا اجلا چہرہ ایسے ہی تھا جیسے سبز پتیوں کے درمیان سرخ و سپید پھول۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں نزاکت کا ایسا تاثر لئے ہوئے تھیں جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیوں مجھے اس بدبخت شخص کا خیال آیا جس نے فرحین کو پایا تھا اور کھو دیا تھا۔ یقیناً وہ شخص بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم تھا۔

اچانک فوزیہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "او مائی گاڈ!" اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ "کمرے کی چابیاں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ دروازہ کھلا ہی چھوڑ آئی ہوں۔"

"پھر؟" فرحین نے کہا۔

"آپ بیٹھیں۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ فرحین کچھ کہتی' فوزیہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

یقیناً اس نے ہمیں تنہائی فراہم کی تھی۔ کچھ دیر میں اور فرحین آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ خاموشی نقارے کی طرح ہمارے درمیان گونج رہی تھی اور ایسا ہی ایک نقارہ میرے دل میں بھی بج رہا تھا۔ وہ چند دن پہلے جو الہام سا ہوا تھا کہ زندگی میں کچھ "خوبصورت" ہونے والا ہے۔ درست ثابت ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان یہ خاموشی بڑی ہی معنی خیز اور حوصلہ افزا تھی۔

میں نے کہا۔ "فرحین!.......... مجھے.......... لگتا ہے کہ آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔"

ان کی حیا آلود نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ وہ بولی۔ "تیمور صاحب! چند ماہ پہلے ہم ریسٹورنٹ میں ملے تھے۔ اس وقت مجھے آپ کی باتیں بے حد ناگوار گزری تھیں لیکن اب یہ احساس ہورہا ہے کہ وہ باتیں بہت تلخ ہونے کے باوجود

بہت سچی تھیں۔ اس وقت میں اندھیرے میں تھی' آج مجھے لگتا ہے کہ میں اجالے میں ہوں۔ میں نے خود کو پالیا ہے۔"

"تبدیلی تو آپ کے اندر موجود تھی۔ میں نے تو صرف تھوڑی سی تحریک دی تھی۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے مجھے بہت بڑا سنبھالا دیا ہے۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔"

"نہیں تیمور صاحب! ایسا ہی ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سنبھالا دیا ہے۔ میں بھی تو اندھیروں میں تھا' آپ نے مجھے روشنی کی راہ دکھائی۔ آپ سے ملنے سے پہلے کون سی برائی مجھ میں نہیں تھی۔ آپ کی شخصیت نے بڑی خاموشی اور محبت سے میرے اندر تبدیلیوں کو راہ دی۔"

وہ مسکرائیں۔ "تبدیلی تو آپ کے اندر موجود تھی۔ میں نے تو صرف تھوڑی سی تحریک دی تھی۔" انہوں نے میرا ہی جملہ دہرا کر مجھے خاموش کرا دیا پھر کہنے لگیں۔ "میں سمجھتی تھی کہ میں آپ کی اصلاح کر رہی ہوں.......... مگر.......... آپ نے تو الٹا میری اصلاح کردی۔"

"میں پھر وہی کہوں گا۔ اگر اصلاح کی بات ہے تو پھر شاید ہم دونوں نے ایک دوسرے کی تھوڑی تھوڑی اصلاح کی ہے۔"

ان کے ہاتھ میز پر دھرے تھے۔ نازک وسپید' معصوم کبوتروں جیسے ہاتھ.......... ایسے ہاتھ جنہیں بے ساختہ چھونے اور پیار کرنے کو دل چاہتا تھا۔ کلائیوں میں رنگین چوڑیاں آڑی ترچھی تھیں۔ یہ بالکل وہی منظر تھا جو ایک مرتبہ پہلے بھی شیزان ریسٹورنٹ میں نظر آیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں خواہش مچلی تھی کہ میں ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لوں اور ان کی لطافت کو اپنی ہتھیلیوں میں ہمیشہ کے لئے قید کرلوں.......... آج بھی مجھے ایسی ہی خواہش کا سامنا تھا.......... لیکن آج میں نے اپنی خواہش کو دبایا نہیں۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور فرحین کے نرم ہاتھ پر رکھ دیا۔ یوں لگا جیسے میں نے زندگی کو چھو لیا ہے اور میرے زندہ ہونے کے ساتھ ہی پوری کائنات زندہ ہوکر

گردش میں آگئی ہے۔ فرحین کے ہاتھ میں کپکپی سی نمودار ہوئی۔ انہوں نے میرے ہاتھ کے نیچے سے اپناہاتھ نکالنے کی کمزور سی کوشش کی۔ میں نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔

"پلیز فرحین! اسے میرے ہاتھ میں رہنے دو۔"

ان کے ہاتھ کا لرزیدہ تناؤ ایک دم ختم ہوگیا۔ یہ تبدیلی ایک جاں آفریں خودسپردگی کی علامت تھی۔ فرحین کی آنکھوں پر گھنیری پلکوں کا سایہ تھا۔ مجھے لگا جیسے دور جھیل سیف الملوک پر جھکے ہوئے بادل ہمیں دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔

☆======☆======☆

میری اور فرحین کی شادی کو چھ برس گزر چکے ہیں........ ہماری شادی لاہور ہی میں ہوئی تھی۔ اس "شادی" کو بخیروخوبی منعقد کرنے میں میرے پیارے دوست اخلاق اور ندیم نے بھرپور حصہ لیا۔ اس کے علاوہ فوزیہ کے کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ فوزیہ کے ذہن میں لاشعوری طور پر یہ ندامت موجود تھی کہ ٹور کے دوران میں شوگران میں اس کی وجہ سے میرے لئے رسوائی اور ذہنی اذیت کا سامان ہوا تھا۔ اس دکھ کا مداوا کرنے کے لئے اس نے میری شادی کے راستے میں موجود چھوٹی چھوٹی کئی رکاوٹوں کو ملیامیٹ کیا اور اس کام میں میرے یارغار اخلاق نے بھی قرار واقعی ساتھ دیا۔ چھوٹے بڑے تایا سمیت ہماری فیملی میں سے کئی گھرانوں نے اس شادی میں شرکت نہیں کی لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ نہ ہی اب تک کوئی پچھتاوا ہے۔ میری والدہ کا ذرا صوفیانہ رنگ میں کہا گیا ایک شعر تھا۔ یہ شعر والدہ اور والد کو مشترکہ طور پر پسند تھا۔ شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ سچ چھپانے والا روگ نہیں ہے۔ اپنے اس روگ پر شرمندہ ہونا یا پچھتانا اس کو چھپانے ہی کی طرح گناہ ہے........ اب کچھ عرصے سے بڑے تایا نے ہم سے ملنا شروع کردیا ہے اور اس تبدیلی کا سب سے زیادہ کریڈٹ اخلاق کو ہی جاتا ہے۔ بڑے تایا کا نافرمان بیٹا کامران امریکا کا ہی ہوکر رہ گیا ہے۔ مہینے گزر جاتے ہیں لیکن وہ گھر میں فون نہیں کرتا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میری اور فرحین کی شادی کو چھ برس گزر چکے ہیں۔ خدا کے فضل سے یہ ایک کامیاب ترین شادی ہے۔ ہمارے آنگن میں تین خوبصورت پھول مسکراتے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی........ جن دنوں فرحین مجھ سے دور تھی اور میں

شب و روز دیوانوں کی طرح اس کی فون کال کا انتظار کیا کرتا تھا' میں اکثر سوچتا تھا۔ یاخدا! مجھ سے زندگی میں کون سی غلطی ہوئی جس کے بدلے مسلسل انتظار کی اس قدر کڑی سزا مجھے مل رہی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں' یاخدا! میں نے کون سی ایسی نیکی کی تھی جس کے بدلے میں تونے مجھے ایسی پیاری شریک حیات اور اتنا پیارا گھر انعام کیا ہے۔ یقیناً یہ اس خدا کا فضل وکرم اور احسان ہی ہے۔ فرحین کو اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے اور وہ کام میں خوش بھی بہت رہتی ہے۔ وہ ابھی کمپیوٹر کی اسی پرائیویٹ یونیورسٹی سے منسلک ہے۔

میری طرف سے اسے کام کرنے یا نہ کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ میں اتنا کمالیتا ہوں کہ زندگی کی گاڑی آسانی سے رواں رہ سکے۔ میرا مزاج بالکل تبدیل ہوچکا ہے۔ ماضی کی کمزوریاں اب قصۂ پارینہ ہیں۔ دو تین برس سے خدا نے توفیق دی ہے کہ میں باقاعدگی سے نماز ادا کرنے لگا ہوں۔ خدا سے توفیق مانگتا ہوں کہ دیگر دینی فرائض بھی پابندی سے ادا کروں۔

شادی کے اتنے عرصے بعد بھی ہم دونوں ایک دوسرے کو آپ کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں۔ کبھی ہم دونوں خوشگوار موڈ میں ہوتے ہیں تو میں فرحین سے کہتا ہوں۔

"فرحین! آپ اپنی تمام تر نیکیوں سمیت میرے اندر حلول کرگئی ہیں۔ آپ نے بے شمار تبدیلیاں پیدا کی ہیں میرے اندر۔"

وہ مسکراتی ہے۔ "آپ کی پیدا کی ہوئی ایک تبدیلی ان تمام تبدیلیوں پر بھاری ہے۔"

"کیسی تبدیلی؟"

"میری زندگی ایک ٹھہرے ہوئے مُردہ پانی جیسی تھی۔ آپ نے اس پانی کو روانی دی اور ایک جیتی جاگتی ندی جیسا بنا دیا۔"

کسی وقت تنہائی میں' میں سوچتا ہوں۔ ہمارا دین' فطرت کا دین ہے پھر ہم معاشرے کے خوف سے فطرت کو مسخ کیوں کرتے ہیں۔ کیوں خود کو ایسی ناروا پابندیوں میں جکڑتے ہیں جن کی بنیاد صرف اور صرف سماج ہے۔ کبھی کبھی تو صاف یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم اپنے دین کو اپنے کہنہ سماج کے تابع کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور یہ دین کی روح

سے بغاوت ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے بغاوت ہے اور فطرت سے بغاوت کر کے کون سکھی رہ سکتا ہے۔ خدائی احکامات کے مطابق فطرت کا رواں دواں رہنا ہی زندگی کا حسن ہے۔

کل میرا بڑا بیٹا ابوبکر توتلی زبان میں پوچھ رہا تھا۔ "ابو نیچر کیا ہے؟"

میں نے اس سے کہا۔ "بیٹا! نیچر کا مطلب ہے فطرت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی۔"

ابوبکر چھوٹا ہے' وہ بڑا ہوتا تو میں اسے ذرا تفصیل سے سمجھاتا.......... میں اسے بتاتا۔ "بیٹا' فطرت ایک خوبصورت پیارے سے گھر کا نام ہے.......... اور فطرت پسینے کے ان قطروں کا نام ہے جو حصولِ رزق کے لئے پیشانی سے گرائے جاتے ہیں.......... اور فطرت اپنے بچوں کے درمیان فراغت کی ایک رنگین شام کا نام ہے.......... اور ہاں مائی چائلڈ! فطرت اس "تلخ فیصلے" کا نام بھی ہے جو معاشرے کا خوف کھائے بغیر مُردہ زندگیوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

☆======ختم شد======☆